وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

اس شمارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک مفصّل ...
حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے میرا تعلق
اور مدیر بینات کے ذہنی ... کے ضمن میں گذارشات

ماہنامہ میثاق لاہور

اشاعت خصوصی بموقع

دس سالہ اجتماع تنظیم اسلامی پاکستان

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن — لاہور

پنجاب بیوریجز کمپنی لمیٹڈ۔ فیصل آباد۔ فون: ۲۶۰۳۱ / ۲۳۹۳۱

Ahmad Afzar
192-G, BLOCK-2
P.E.C.H.S., KARACHI-29
Phone: 440803

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۳۴ | مارچ ۱۹۸۵ء مطابق جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ | شمارہ ۳

* تنظیم کا دسواں سالانہ اجتماع —— ۲
* عرضِ احوال —— ۴
—— جمیل الرحمٰن
* تذکرہ و تبصرہ —— ۹
[حضرت مولانا یوسف بنوریؒ سے میرا تعلق —— اور مدیر "بینات" کے فرمودات کے ضمن میں گذارشات]
[قادیانی مسئلہ اور اس کا نیا اور پیچیدہ تر مرحلہ]
—— ڈاکٹر اسرار احمد
* گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را —— ۴۶
تذکرہ و تبصرہ شائع شدہ نومبر ۶۷ء
تذکرہ و تبصرہ شائع شدہ میثاق دسمبر ۶۷ء
—— ڈاکٹر اسرار احمد
* فرائض دینی کا جامع تصور —— ۷۳
اور اس پر دعوتِ تنقید و ہدایت
—— ڈاکٹر اسرار احمد کا عریضہ بنام علمائے کرام
* اطاعتِ امیر —— ۸۳
—— ماخوذ از لٹریچر جماعت المسلمین
* افکار و آراء —— ۱۰۱

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون
۳۰ روپے
قیمت فی شمارہ
۳ روپے

ناشر
ڈاکٹر اسرار احمد
طابع
چودھری رشید احمد
مطبع
مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

مکتبہ تنظیمِ اسلامی
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی
کراچی فون برائے رابطہ
۲۱۴۷۰۹

اس شمارے کی قیمت -/۴ روپے

تنظیمِ اسلامی

کے نام سے، اقامتِ دین، کی جدّوجہد کے لیے ایک نئے قافلے کی تشکیل

۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء

کو ہوئی تھی اور اواخر مارچ ۸۵ء میں منعقد ہونے والا سالانہ اجتماع اس کا

دس سالہ اجتماع

ہوگا جو اِن شاء اللہ العزیز اس کی تاریخ کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوگا!

پاکستان کے طول و عرض میں

جن حضرات نے بھی تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کے لیے مجھ سے بیعت کی ہے

وہ امکانی حد تک کوشش کریں کہ جمعہ ۲۲ مارچ کو قبل از دوپہر لاہور پہنچ جائیں

اور اس ضمن میں طبیعت پر کسی کسل، شیطان کی کسی چال اور علائق دنیوی کے کسی بندھن کو رکاوٹ نہ بننے دیں

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا! — تنہا نہیں لوٹی کبھی آوازِ جرس کی!
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

اس ضمن میں جملہ رفقاء اور امراء کو چاہیے کہ قیم تنظیم چوہدری غلام محمد صاحب کی ہدایات پر پوری توجہ سے عمل کریں

اسرار احمد عفی عنہ

(سامنے کے صفحہ کی عبارت کو بھی غور سے پڑھیں)

قیم تنظیم کی بعض نہایت اہم ہدایات کیلئے صفحہ ۱۲۰ ضرور دیکھئے!

اگر آپ کسی اجتماعیّت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں

تو

- اس کے اجتماعات میں شریک ہونے سے گریز کیجئے۔ مختلف مصروفیات کی آڑ لے کر شرکت سے بچنے کے بہانے تراشیئے۔
- اگر کسی اجتماع میں شرکت کرنی ہی پڑ جائے تو دیر سے پہنچنے کی کوشش کیجئے۔
- اگر آپ کو کسی وجہ سے درس اور اجتماع کی بروقت اطلاع نہ دی جا سکے تو ذمہ دار حضرات کو سخت سُست کہئے، لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ٹھہرایئے۔
- اجتماعات کے اندر ذمہ دار افراد پر کھلے عام کڑی تنقید اور نکتہ چینی کیجئے، انتظامات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا نہ بھولیے۔
- بھول کر بھی کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کیجئے، کسی قسم کا کوئی کام ہرگز نہ کیجئے۔ ہاں کام کرنے والوں پر تنقید ضرور کیجئے۔
- اگر آپ سے کسی مسئلہ پر رائے لی جائے تو ہمیشہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے سے گریز کیجئے اور بعد میں لوگوں سے یہ ضرور کہئے کہ اس کام کو یوں ہونا چاہیئے تھا۔ یوں نہیں۔
- اوّل تو مالی اعانت کبھی نہ کیجئے اور اگر مجبوراً کرنی ہی پڑ جائے تو کم سے کم دیجئے۔ مگر سہولتیں اور آسانیاں زیادہ سے زیادہ حاصل کیجئے۔
- دُوسرے کی ذات پر تنقید کا سُنہری موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیجئے، ہمیشہ دُوسروں پر کیچڑ اُچھالنے کی تاک میں لگے رہیئے۔
- ذاتی مفاد کو ہمیشہ اجتماعی مفاد پر ترجیح دیجئے۔

ان نہایت ہی سادہ اور زرّیں اصُولوں پر عمل کر دیکھئے، انشاء اللہ آپ کم سے کم وقت میں کسی بھی منظم تحریک کے تار و پود نہایت آسانی سے بکھیر کر رکھ دیں گے۔ !

اور

اگر آپ کسی اجتماعیت کے ساتھ مخلص ہیں۔ اس کو روز بروز ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو للہ ان اصُولوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیجئے۔

(بشکریہ "حبلُ اللہ" کراچی)

جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

عرضِ احوال

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

جمادی الثانی ۱۴۰۵ھ مطابق مارچ ۱۹۸۵ء کا 'میثاق' مدیۂ قارئین ہے۔ یہ شمارہ اس لحاظ سے ایک خاص چیز بن گیا ہے کہ اس میں امیرِ تنظیم اسلامی و صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ العالی کے چند اہم رشحاتِ قلم شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا یہ بھی ایک مظہر ہوتا ہے کہ وہ عزّ وجل بظاہر احوال کسی تکلیف اور مصیبت کو بھی نافع اور مفید بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف وسطِ ستمبر ۸۴ء میں کمر کے درد میں ایسے مبتلا ہوئے کہ قریباً صاحبِ فراش ہو گئے اور قریباً دو عشروں تک دروس و خطابات اور بیرونِ لاہور کے دعوتی دوروں کا سلسلہ معطّل رہا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے یہ خیر پیدا فرمایا کہ امیرِ محترم کے قلم پر عرصۂ دراز سے جو گرہ لگی ہوئی تھی اور طبیعت تحریری کام پر آمادہ نہیں ہوتی تھی تو اس کے فضل و کرم سے یہ گرہ کھل گئی اور تحریری کام کے لئے انشراحِ صدر حاصل ہو گیا ــــ چنانچہ اکتوبر ۸۴ء سے موصوف نے تحریری کام کا آغاز کیا جو نومبر کے 'میثاق' کے ذریعہ قارئین کرام کی نظر سے ہر ماہ گزر رہا ہو گا۔

زیرِ نظر شمارے میں امیرِ محترم کی چھ تحریریں شامل ہیں جن میں سے چار تازہ ترین ہیں اور دو قریباً دس سال قبل کی تحریریں ہیں۔ پرانی تحریروں میں سے ایک تحریر تنظیم اسلامی کے قیام کے اعلان اور تاسیسی اجتماع کے دوران دسمبر ۷۴ء کے 'میثاق' میں "تذکرہ و تبصرہ" کے عنوان کے تحت لکھی گئی تھی جس میں جماعت اسلامی کے متوسلین اور سابقین کی خدمت میں چند معروضات پیش کی گئی تھیں اسے قندِ مکرر کے طور پر بغرض افادہ شامل کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایک طرف ان حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہے جو طریقِ کار کے اختلاف کی وجہ سے ماضی میں جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے تو دوسری طرف موجودہ قارئین 'میثاق' بالخصوص رفقاءِ تنظیم کے سامنے امیرِ محترم کا دس سال قبل کا اندازِ فکر آ جائے گا۔ جو ان شاء اللہ متعدد پہلوؤں سے مفید ہو گا۔ ساتھ ہی ان حضرات کے لئے بھی غور و فکر کی راہیں کھل جائیں گی جو فی الوقت کالعدم جماعتِ اسلامی کے موجودہ طریقِ کار سے غیر مطمئن ہیں۔

دوسری پرانی تحریر اس "تذکرہ و تبصرہ" پر مشتمل ہے جو 'میثاق' نومبر ۷۴ء میں تحریک ختمِ نبوّت کے نتیجے میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر امیرِ محترم نے سپردِ قلم فرمایا تھا۔ اسی میں موصوف

کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک کے دوران ماہ جون ۷۴ء کو انہوں نے مسجد خضرا سمن آباد لاہور میں خطاباتِ جمعہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی۔

قادیانیوں نے اب پھر کچھ عرصہ سے جدید نوع کی جارحیت کا انداز اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے متعلق امیرِ محترم کی ایک تازہ تحریر "قادیانی مسئلہ اور اس کا نیا اور پیچیدہ تیسرا مرحلہ" کے موضوع پر "تذکرہ وتبصرہ ۲" ہی کے عنوان کے تحت شاملِ اشاعت ہے۔ جس میں امیرِ محترم نے قادیانیوں کی موجودہ ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور ان کے غیر مسلم قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ان کی طرف سے جو مگرمچھ کے آنسو، کے مصداق واویلا مچایا اور خود کو مظلوم بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر چند "دانشور" قسم کے لوگ مسئلہ کی اصل حقیقت کے شعور و ادراک کے بغیر ان کی حمایت میں اخباری بیان دے رہے اور پمفلٹ وغیرہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے مسئلہ کی صحیح و حقیقی صورت پیش کی ہے تاکہ اگر یہ دانشور کسی مغالطہ اور غلط فہمی کی بنیاد پر قادیانیوں کی بے جا حمایت کر رہے ہیں تو وہ دور ہو جائے ——

تازہ ترین تحریروں میں سے پہلی تحریر "تذکرہ وتبصرہ" کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ 'میثاق' کے ستمبر ۸۴ء کے شمارے میں امیرِ محترم کا ایک خطاب بعنوان "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات" شائع ہوا تھا۔ جس پر متعدد مخلصین نے اپنے خیر خواہانہ مشورے تبصرے، تنقیدیں اور آراء و تاثرات براہِ راست ادارہ کو ارسال فرمائے تھے جو اکتوبر و نومبر کے میثاق کے شماروں میں شائع کر دیئے گئے تھے۔ نیز معاصر 'ماہنامہ الخیر' ملتان میں دو تنقیدی مضامین شائع ہوئے تھے۔ جن کے ضمن میں امیرِ محترم کی گذارشات ماہِ دسمبر ۸۴ء میں شائع کر دی گئی تھیں —— لیکن امیرِ محترم کے ستمبر ۸۴ء والے خطاب کے سلسلہ میں ذاتی خطوط کے ذریعہ نقد و نظر، تبصروں اور مشوروں کا سلسلہ جاری تھا اس لئے اس موضوع پر "تذکرہ وتبصرہ" ہی کے عنوان سے امیرِ محترم کی دوسری تحریر جنوری ۸۵ء میں شائع ہوئی —— اسی شمارے میں مولانا سید اخلاق حسین قاسمی مدظلہ، کا ایک مضمون "ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علماءِ دیوبند" کے عنوان سے شائع ہوا جس کی روشنی میں امیرِ محترم کی "شیخ الہند کی جماعت" کے عنوان پر ایک مفصل تحریر فروری ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے —— اسی دوران معاصر عزیز 'ماہنامہ بینات' کراچی کے ادارتی صفحات میں اس کے مدیر محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ، کی ادارتی کالموں میں تنقید ایک محاجہ کے اسلوب سے شائع ہونا شروع ہوئی۔ اس ضمن میں امیرِ محترم نے مناسب سمجھا کہ اس پر اپنی گذارشات مضمون کی تکمیل کے بعد

پیش فرمائیں ـــــ اب چونکہ 'بیّنات' کے فروری کے شمارے میں یہ نقد و نظر مکمل ہو گیا ہے لہٰذا زیرِ نظر شمارے میں "تذکرہ و تبصرہ" ہی کے عنوان سے امیرِ محترم نے جہاں اپنے گذشتہ ماہ کے مضمون کے بعض گوشوں اور پہلوؤں کی مزید توضیح و تشریح کی ہے وہاں مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ کے تبصرے اور تنقید پر اپنی معروضات پیش کی ہیں۔ 'میثاق' کے جو قارئین کرام مولانا موصوف کے اعتراضات محاکمہ و محاجّہ کے دلائل کو پوری طرح سمجھنے کے خواہشمند ہوں ان کی خدمت میں ہم یہ مشورہ پیش کریں گے کہ معاصر 'ماہنامہ بیّنات' کراچی ۵ سے جنوری اور فروری ۸۵ء کے دونوں شمارے طلب فرما کر مولانا موصوف کے اس مضمون کا ضرور بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں۔ اس طرح امیرِ محترم کی گذارشات اور وضاحتوں کی تفہیم میں بڑی مدد ملے گی ـــــ اس ضمن میں ہم مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ کے الطافِ خسروانہ کے پیشِ نظر موصوف سے یہ استدعا کریں گے کہ وہ معاصر 'بیّنات' کے شمارے میں اس امر کا تذکرہ فرمادیں کہ "جو حضرات 'بیّنات' کے جنوری و فروری ۸۵ء کے ادارتی کالموں میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے متعلق شائع شدہ تبصرہ و تنقید پر ڈاکٹر صاحب کی معروضات کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہوں وہ ماہنامہ 'میثاق' لاہور ۱۴ کا مارچ ۸۵ء کا شمارہ ضرور ملاحظہ فرمائیں ـــــ ان شاء اللہ افہام و تفہیم کے لئے اس طرح ایک نہایت صحت مند اور مفید روایت قائم ہو جائے گی ـــــ

تازہ ترین تحریروں میں ایک تحریر امیرِ محترم کے اس مکتوب پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے برِّصغیر پاک و ہند کے متعدّد اصحابِ علم و فضل کو ۲۳ تا ۲۸ مارچ منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی میں شرکت اور فرائضِ دینی کے اُس جامع تصوّر پر اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے جو امیرِ محترم نے قرآن حکیم اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے اخذ کیا ہے اور جس کی تبلیغ و دعوت کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ یہ مکتوب متعدد اصحابِ علم و فضل کی خدمت میں نام بنام بھی ارسال کیا جا چکا ہے۔ اس مکتوب کے بعد تیسری تحریر "فرائضِ دینی کا جامع تصوّر" کے نکات پر مشتمل ہے۔ جن پر علماءِ کرام کی رہنمائی مطلوب ہے۔

امیرِ محترم کی ان تحریروں کے علاوہ ایک اہم مضمون "امیر کی اطاعت" کے عنوان سے شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون "جماعت المسلمین" کراچی ۳۸ کے شکریہ کے ساتھ اس کے ایک کتابچے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے کتاب و سنّت سے اسلامی ریاست اور اسلامی نظمِ جماعت میں "امیر کی اطاعت" کا جو مقام ہے وہ نہایت واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آتا جاتا ہے ـــــ چونکہ "تنظیمِ اسلامی" کی تاسیس اسلام کے ٹھیٹھ اور خالص اصول ہیئتِ اجتماعی "بیعت" پر ہوئی ہے لہٰذا اس میں

امیرِ تنظیم یا اس کے مقرر کردہ اصحابِ امر اور نائبین کی اطاعت فی المعروف کی بڑی اہمیت ہے بلکہ اس کے بغیر اُس جماعت و تنظیم کے تقاضے پورے ہی نہیں ہوتے جو خالص اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کے لئے قائم ہوئی ہو۔ ایسی تنظیمی ہیئت میں امیر کی اطاعت فی المعروف وجوب کا مقام رکھتی ہے۔ یہ بات ان شاء اللہ اس مضمون کے مطالعہ سے رفقاءِ تنظیم کے سامنے روزِ روشن کی طرح آجائے گی۔ مزید برآں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع سے قبل اس کا مطالعہ رفقاءِ تنظیم کے لئے ان شاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوگا جو ۲۳ مارچ سے ۲۸ مارچ تک قرآن اکیڈمی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس اجتماع میں رفقاء کے علاوہ ایسے حضرات بھی بطور مبصر شرکت کر سکتے ہیں جو تنظیم اسلامی سے تھوڑے بہت متعارف ہوں اور اس کی دعوت و طریقِ کار اور خصائص و مبادی کو قریب سے دیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ ایسے حضرات اجتماع میں شرکت کے لئے مقامی تنظیموں کے امراء سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں یا اپنی تشریف آوری کی براہِ راست اطلاع محترم قیم تنظیم اسلامی (پاکستان) لاہور کو بذریعہ خط دے سکتے ہیں۔

امیرِ محترم کی تحریرات اور "امیر کی اطاعت" کے مضمون کی وجہ سے اس شمارے میں امیرِ محترم کا خطاب بعنوان "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" "الہدٰی" اور "حدِّ رجم" کی اقساط نیز چند دوسرے مضامین شاملِ اشاعت نہیں ہو سکے۔ ان شاء اللہ یہ آئندہ شمارے میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ مزید براں "ماہنامہ حکمت قرآن" کے قارئین مطلع رہیں کہ مارچ اور اپریل ۸۴ء کا مشترکہ شمارہ ان شاء اللہ اوائل اپریل میں شائع ہوگا۔

وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ؕ

ضرورت رشتہ

ایم اے - اسلامیات (فرسٹ ڈویژن)، دوشیزہ عمر سوا چوبیس سال جس نے پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر لیا ہے (انٹرویو باقی ہے)، اسلامی روایات کی پابند اور امورِ خانہ داری میں ماہر ہے، کے لئے خالصتاً اسلامی ذہن والے ہم پلہ نوجوان جو تنظیم اسلامی سے باضابطہ منسلک ہوں یا دلچسپی رکھتے ہوں بلا تفریق ذات، جہیز کی خواہش سے مبرّا اور نکاح و رخصتی کی ادائیگی مسجد میں ہونے پر رضامند ہوں رجوع کریں۔

معرفت : بکس ۱۰۱ - قرآن اکیڈمی - ۳۶، K ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اِس قدر ہوگی ترنّم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!!

"یعنی وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اسرار احمد

جماعتِ شیخ الہندؒ سے میرا قلبی تعلق

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے میرے روابط

اور مدیرِ بینات، کراچی کے فرمودات کے ضمن میں کچھ گذارشات!

گذشتہ ماہ کے طویل 'تذکرہ و تبصرہ' کے آخری حصے کی تحریر کے وقت راقم الحروف پر ایک عجیب 'نشہ' کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ چنانچہ حسبِ ذیل الفاظ بھی اسی کیفیت میں سپردِ قلم ہو گئے تھے[۱]

"چنانچہ راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ راقم کے دل میں بلا تکلف و تصنع از خود محبت و عقیدت پیدا ہو جاتی ہے ہر اُس شخص سے جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق رہا ہو حضرت شیخ الہندؒ سے ــــ یا جسے ادنیٰ سے ادنیٰ نسبت حاصل ہو ان کی ذاتِ گرامی سے اور راقم ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے جملہ متوسلانِ حضرتِ شیخ الہندؒ کی خدمت میں کہ خدارا! وقت کی پکار کو کھلے اور متوجہ کانوں اور 'کشادہ' و 'حاضر' دلوں سے سُنیں بمصداقِ الفاظِ قرآنی 'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ' !!!"

بعد میں محسوس ہوا کہ یہ فی الحقیقت "مستی" کی کیفیت میں نکلی ہوئی نہایت ہی "سچی بات" ہے![۲] چنانچہ بعد میں ماضی کے جھروکوں میں مزید جھانکا ــــ اور اپنے ذہن و شعور کی تحتانی

---

[۱] اسی کیفیت میں علامہ اقبال مرحوم کے اُن اشعار کی جانب بھی ذہن اچانک منتقل ہو گیا تھا جو گذشتہ ماہ بھی شاملِ اشاعت تھے اور اس ماہ پھر نمایاں طور پر شائع کئے جا رہے ہیں۔ ورنہ راقم کے قارئین اور سامعین کے علم میں ہے کہ علامہ کے یہ اشعار اس سے قبل کبھی بھی راقم کی تحریر یا تقریر میں نہیں آئے۔ بعد میں کئی دن یہ اشعار راقم کے ذہن پر سوار رہے اور تنہائی میں بے اختیار زبان پر جاری ہوتے رہے اور دل کی گہرائیوں سے علامہ کے لئے دعائیں نکلتی رہیں! (اشعار سامنے کے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

[۲] "نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں   فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا!"

سطروں میں مزید کھود کرید کی تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ راقم ابتداءً ایک مہم سے جذبۂ ملّی اور بعد میں جدید تہذیبی و عمرانی نظریات اور سائنس و ٹیکنالوجی کے پیدا شدہ مسائل و معاملات کے ضمن میں 'فکرِ قرآنی' کے سلسلے میں شدید زیرِ بارِ احسان اور مرہونِ منّت ہے علّامہ اقبال مرحوم و مغفور کا ـــــ اور 'تدبّرِ قرآن' کے سائنٹفک طریق کے ضمن میں خوشہ چین ہے علّامہ حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا ـــــ تاہم راقم کا قلبی جھکاؤ اور لگاؤ رہا ہے ان ہی شخصیتوں کی جانب جن کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے حضرت شیخ الہندؒ سے!

حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ جامع الصّفات سے علم و عمل کے جو چشمے جاری ہوئے ان کا ایک اجمالی ذکر گذشتہ صحبت میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا سے تأمّل سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:-

حضرت شیخ الہندؒ کے نام نامی سے سب سے زیادہ نمایاں طور پر "معنون" سلسلہ تو وہ ہے جو حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی ذات سے چلا ـــــ جبکہ راقم کے نزدیک حضرتؒ کی حیاتِ مستعار کے آخری دَور کی کیفیات کے اعتبار سے سب سے زیادہ 'مستند' سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، دوسری کڑی تھے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور تیسری کڑی ہے 'بزمِ خویش' ان سطور کا حقیر و عاجز راقم!

مزید برآں ایک سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور، جن پر آخری عمر میں 'انقلابیت' کچھ زیادہ ہی طاری ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کے عزیز و شاگرد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ان کے راستے سے ذرا ہٹ کر پوری طرح ضمّ اور مدغم ہو گئے متذکرہ بالا 'سلسلۂ اولیٰ' ہی میں ـــــ جبکہ ایک سلسلہ وہ ہے جو اس کے بالکل برعکس اُس 'سلسلۂ اولیٰ' سے قومی اور ملّی سیاست کے ضمن میں اختلافِ رائے کی بنا پر منقطع ہو کر جملہ مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک ـــــ یعنی تحریکِ پاکستان کے ساتھ جسے حلقۂ دیوبند ہی کی ایک دوسری عظیم شخصیت یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حمایت و تائید حاصل تھی۔ اس سلسلے کی اوّلین کڑی تھی مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے جانشین کی حیثیت حاصل ہوئی مفتی محمد شفیعؒ کو۔

انگریزی مثل "Last but not the Least" کے مصداق ذکر میں آخری اور پانچواں لیکن خالص علمی اعتبار سے اوّلین اور اہم ترین سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا

سید انور شاہ کاشمیریؒ ـــــ اور دوسری اہم ترین کڑی تھے مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ۔

ان 'سلاسلِ خمسہ' کی اوّلین شخصیتوں کی زیارت کی سعادت تو راقم کو بُعدِ زمانی ومکانی کے باعث حاصل نہیں ہو سکی لیکن دوسری اور تیسری کڑیوں کی حیثیت رکھنے والے حضرات میں سے اکثر سے نیازمندی اور حصولِ فیضِ صحبت کے مواقع میسّر آئے۔ اور بعض دوسرے علماءِ کرام کے علمی تبحّر اور خلوص واخلاص کے پوری طرح قائل ومعترف ہونے کے باوجود قلبی میلان صرف ان ہی حضرات کی جانب رہا۔

لاہور میں راقم کی نیازمندی اور گاہ بگاہ حاضری کا سلسلہ اگرچہ بعض دوسرے حضرات کے یہاں بھی ہے لیکن سب سے زیادہ ربط وتعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز اور جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ سے ہے، جو تنظیمِ اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں بھی شامل ہیں۔

دہلی کے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ بھی جو حال ہی میں تنظیم کے حلقۂ مستشارین میں شامل ہوئے ہیں، جمعیت علماء ہند ہی کے پرانے متوسّلین میں سے ہیں اگرچہ فی الوقت ان کا کسی قدر اختلاف مولانا اسعد مدنی خلف الرشید مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہے!

حضرتِ لاہوریؒ کی تو صرف ایک بار زیارت کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن لاہور میں دوسرے نمبر پر راقم کی حاضری کا معاملہ ان کے جانشین مولانا عبید اللہ انور مدظلہٗ ہی کی خدمت میں ہوتا رہا۔ چنانچہ کئی سال وہ قرآن کانفرنسوں میں بھی تشریف لاتے رہے اور ہمارے بعض دوسرے اجتماعات میں بھی شرکت فرماتے رہے۔ ایک تقریر جو اب "شہید مظلومؓ" کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں طبع ہوئی ہے، راقم نے اُن ہی کی مسجد میں اُن ہی کی زیرِ صدارت کی۔ اور ۱۹۷۴ء میں جس 'قرآنی تربیت گاہ' کے اختتام پر راقم نے 'تنظیمِ اسلامی' کے قیام کا اعلان کیا اس کی افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی بھی وہی تھے اور انہوں نے نہایت شاندار بلکہ 'شرمسار کُن' الفاظ میں راقم الحروف کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ اگرچہ اِدھر کچھ عرصہ سے وہ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر راقم اور اس کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے اجتماعات سے پہلوتہی فرمانے لگے ہیں اور راقم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے اب بھی ان کی سرپرستی حاصل ہے۔

مولانا سندھی مرحوم کے شاگردوں، شارحوں اور راویوں میں سے پروفیسر محمد سرور مرحوم سے راقم کو بھی اُنس تھا ـــــ اور وہ بھی راقم سے بہت دلچسپی رکھتے تھے ـــــ حتیٰ کہ

عمر کے آخری دور میں اگرچہ تقدیر انہیں کھینچ کر اسلام آباد ایک سرکاری ادارے میں لے گئی ـــــ لیکن خود ان کی شدید خواہش 'قرآن اکیڈمی' ہی میں ڈیرہ لگا لینے کی تھی ـــــ (ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا موقع بھی راقم کو حاصل ہوا) دوسری طرف مولانا سندھیؒ کے دو مستدین 'دیوانوں' یعنی شیخ بشیر احمد لدھیانوی مرحوم اور محمد مقبول عالم مرحوم سے بھی راقم کا خاصا ربط ضبط رہا ـــ چنانچہ ان کے مضامین بھی 'میثاق' میں شائع ہوتے رہے اور ان کے حوالے سے مولانا سندھیؒ کے فکر کا تعارف بھی ایک مضمون میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے کرایا[1]۔

ادھر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیارت تو راقم کو نصیب نہ ہوئی لیکن راقم کے لئے یہ خیال بہت غنیمت ہے کہ راقم کا ایک غائبانہ اور معنوی تعلق ان سے اس طرح بنتا ہے کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کر رہے تھے اس وقت راقم الحروف بھی تحریکِ پاکستان کے ایک ننھے کارکن کی حیثیت سے (بطور جنرل سیکرٹری حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن) ضلع حصار کے قصبات ہانسی، سرسہ وغیرہ کے ہائی اسکولوں کے طلبہ کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے سفر کیا کرتا تھا۔ باقی مولاناؒ کا جو معنوی فیض صحبت راقم کو ان کے 'حواشیٔ ترجمۂ قرآن' کے ذریعے حاصل رہا ہے اس کا تفصیلی ذکر گذشتہ اشاعت میں آ ہی چکا ہے۔

البتہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کے راقم کو ۶۴-۱۹۶۵ء میں وافر مواقع ملے۔

---

[1] مولانا سندھی مرحوم اور حضرت لاہوریؒ کے ساتھ راقم کے ایک اور تعلق کا راز بھی آج فاش ہو جائے تو بہتر ہے۔ اور وہ یہ کہ حاجی عبدالواحد صاحب 'ایم۔اے' جو ایک سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر مولانا سندھیؒ سے کسبِ فیض کرتے رہے ـــ بعد ازاں حضرت لاہوریؒ سے بیعت ارشاد میں منسلک ہوئے' (مزید برآں ایک طویل سفر میں مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ اور مولانا علی میاں مدظلہٗ کے ہمرکاب رہے جس کا مقصد وحید اعلاءِ کلمۃ اللہ کی تحریک کے لئے کسی "داعی" کی تلاش تھا ـــ بعد ازاں کچھ عرصہ ندوۃ العلماء میں مقیم رہ کر عربی کی تحصیل کرتے رہے) پہلے شخص ہیں جنہوں نے راقم الحروف سے اس وقت 'بیعت جہاد' کی جبکہ خود راقم کو ابھی اس کا خیال بھی نہیں تھا۔ اور انہوں نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر بیعت کی تھی!

خصوصاً ان چھ ماہ کے دوران جبکہ راقم کی رہائش بھی کورنگی میں 'دارالعلوم' کے نہایت قریب تھی اور رمضان المبارک میں اعتکاف بھی راقم نے دارالعلوم ہی کی مسجد میں کیا تھا، جس کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ کے خویش کلاں مولانا نور احمد صاحب سے بہت قرب رہا تھا!

حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادوں میں سے مولانا رفیع عثمانی اور مولانا تقی عثمانی سے بھی ان دنوں کافی ملاقاتیں رہیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحب سے بعد میں بھی متعدد بار ملنا ہوا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی بعض تحریروں کی 'میثاق' میں اشاعت پر احتجاج کیا۔ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک رسالہ دکھایا جو انہوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے تفسیری حواشی پر تنقید و اصلاح کے ضمن میں "التقصیر فی التفسیر" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ ایک بار میری درخواست پر انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام 'قرآن کانفرنس' منعقدہ کراچی کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی [1]

حضرت شیخ الہند سے معنوی تعلق ہی کا یہ فیض بھی ہے کہ دیوبند میں قائم 'شیخ الہندؒ اکیڈمی' کے ڈائریکٹر مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہٗ کی بھی خصوصی شفقت و عنایت گذشتہ

---

[1] تاہم چند دن ہوئے تنظیم اسلامی کے ایک نوجوان رفیق نے ان کے والد ماجد کے استفتاء پر مولانا تقی عثمانی صاحب کے دستخط سے جاری شدہ تحریر دکھائی جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ راقم الحروف باضابطہ عالم دین نہیں ہے لہٰذا نہ میری تنظیم میں شمولیت درست ہے نہ میرے دروس میں شرکت! (اس کے بارے میں راقم اپنی گذارشات آگے عرض کرے گا) ساتھ یہ بھی درج تھا کہ انہوں نے (یعنی مولانا تقی عثمانی صاحب نے) نہ میری تقریریں سنی ہیں نہ تحریریں پڑھی ہیں ــــــ ــــ اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اگر وہ 'میثاق' نہیں دیکھتے تھے تو چشتی صاحب کی تحریریں ان کے علم میں کیسے آئیں؟ ــــــ اور کم از کم میری وہ تقریر تو انہوں نے از ابتدا تا انتہا سنی تھی جو میں نے 'قرآن کانفرنس' کے متذکرہ بالا اجلاس میں ان ہی کے زیر صدارت "مقام صحابہؓ" کے موضوع پر کی تھی۔ اور جو اختصار کے باوصف خاصی طویل تھی۔ اس کی اس کے سوا اور کیا تاویل کی جائے کہ کچھ عرصہ گذر جانے کے باعث یہ واقعات مولانا کے حافظے سے محو ہو گئے۔! ــــــ واللہ اعلم!

دو تین سالوں کے دوران راقم الحروف کو حاصل ہو گئی ہے!

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے راقم الحروف کی نسبت کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے! اور خواہ اسے "یہ دعویٰ بہت بڑا ہے، پھر ایسا دعویٰ نہ کیجئے گا!" (حالی) کا مصداقِ کامل ہی قرار دیا جائے راقم کا موقف یہی ہے کہ اُس کی دعوت و تحریک 'الہلال' اور 'البلاغ' ـــــ اور 'ترجمان القرآن' اور 'الجہاد فی الاسلام' ہی کی صدائے بازگشت ہے اور اس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' ـــــ 'حزب اللہ' اور 'جماعتِ اسلامی' ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ذات سے شروع ہونے والے 'سلسلۂ خامسہ' کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کا ذکر راقم کو ذرا تفصیل سے کرنا ہے، اس لئے کہ اس کے موجودہ 'آرگن' ماہنامہ 'بینات' کے دو حالیہ شماروں کے ادارتی صفحات راقم کے تذکرے میں صرف ہوئے ہیں۔

اس سے قبل راقم 'اکابرِ دیوبند' رحمہم اللہ کے ساتھ اپنے ایک اور تعلق کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے ـــــ اور وہ ہے 'زمینی نسبت'، یعنی یہ کہ راقم کے آباد و اجداد کا تعلق بھی یوپی کے مشہور دوآبہ کی اسی سرزمین سے ہے جس میں سہارنپور، دیوبند، کاندھلہ، گنگوہ، نانوتہ، بڈھانہ، جھنجھانہ، کیرانہ، تھانہ بھون اور پھلت ایسے قصبات واقع ہوئے ہیں، جنہوں نے مسلم انڈیا کے ابتدائی دور میں تو شیخ عبد القدوس گنگوہی ایسی عظیم شخصیت پیدا کی تھی ـــــ پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خاندان عطا کیا۔ (یہ حضرات اصلاً قصبہ پھلت کے تھے) بعدازاں مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کو کثیر ترین تعداد میں جہاد و قتال کے ساتھی (Comrades - At - Arms) مہیا کئے۔ اور پھر جملہ اکابرینِ دیوبند کا تحفہ مسلمانانِ ہند کو دیا۔

ان قصبات میں 'شیوخ' کی ایک برادری آباد ہے جن میں سے کچھ تو اپنے ناموں کے ساتھ 'قریشی' کا عمومی لاحقہ لگاتے ہیں اور کچھ تعیّن کے ساتھ صدیقی، فاروقی یا عثمانی لکھتے ہیں ـــــ ان کے رشتے ناطے آپس میں بھی بہت ہیں اور ہندی نو مسلم خاندانوں کے ساتھ بھی، اس طرح ان میں باہر سے آنے والے قدیم الاسلام اور مقامی آبادی میں سے ایمان لانے والے حدیث العہد مسلمان باہم گڈمڈ ہیں۔ راقم کا ددھیال اسی علاقے کے قصبہ حسین پور سے تعلق رکھتا ہے اور ننھیال قصبہ بَنَت سے! میری والدہ صاحبہ تو تعیّن کے ساتھ صدیقی ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ حبّان المصری الیمنی الصّدّیقی تھے جن کی سترھویں پشت میں شیخ محمد طاہر ہندوستان آئے تھے۔ (اس خاندان کے بعض حضرات جیسے مولانا محمد حسین فقیر اور ان کے صاحبزادگان مولانا محمد ابراہیمؒ اور مولانا محمد اسحٰق

قبرستان مہندیاں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے ابناء و احفاد کے قریب محوِ استراحت ہیں!) میرے پڑدادا حافظ نوراللہ صاحب حسین پور میں دیکی حویلی والے، مشہور تھے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد وہ انگریزی حکومت کے زیرِ عتاب آئے اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ مجبوراً انہوں نے نقلِ مکانی کی اور دریائے جمنا عبور کر کے مشرقی پنجاب کے ضلع حصار آ گئے اور سرکاری ملازمت شروع کر دی۔ میرے دادا حاجی محمد یحییٰ بھی وہیں سرکاری ملازمت میں رہے۔ والدِ مرحوم شیخ مختار احمد کے ساتھ ہم سب لوگ ۱۹۴۷ء کے قتلِ عام اور جبری تبادلہ آبادی کے ضمن میں واقعتہً آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے (حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس کا ایک سو ستر میل کا فاصلہ ہم لوگوں نے ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس دنوں میں طے کیا ـــــ اور راستے میں جو مصیبتیں اٹھائیں ان کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہے!) ـــــ الغرض ع۔ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!" کے مصداق یہ بھی میری اکابرینِ دیوبند کے ساتھ ایک نسبت کی اساس ہے!

مولانا سیّد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سیّد محمد یوسف بنّوریؒ کے تذکرے سے قبل چند الفاظ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بارے میں بھی ضروری ہیں۔ مبادا کوئی غلط فہمی راہ پا لے ـــــ مولانا تھانویؒ کو بھی اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ سے ایک نسبتِ تلمذ حاصل تاہم ان کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ یا متوسّلین میں درست نہیں بلکہ وہ ہر اعتبار سے ایک متوازی شخصیت ہیں اور ان کی عظمت خالص ذاتی ہے۔ چنانچہ عمر کے اعتبار سے بھی وہ حضرت شیخ الہندؒ سے صرف بارہ سال چھوٹے ـــــ اور ان کے اکثر تلامذہ سے پندرہ پندرہ بیس بیس سال بڑے تھے۔ پھر ان کا مزاج بھی خالص علمی و اصلاحی تھا ـــــ چنانچہ ان کی اصل توجہات یا تصنیف و تالیف پر مرتکز رہیں یا تزکیہ و سلوک پر، سیاسیات پر وہ نگاہ رکھتے تھے اور آزادانہ رائے کے حامل بھی تھے لیکن اس سے انہیں کوئی عملی دلچسپی نہ تھی ـــــ چنانچہ جہادِ حرّیت اور تحریکِ استخلاصِ وطن میں بھی ان کا کوئی قابلِ ذکر حصّہ نہیں ہے ـــــ لیکن دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ موجودہ پورے حلقۂ دیوبند پر اُن ہی کے علم اور تصوّف کی چھاپ سب سے بڑھ کر ہے اور پاکستان میں اکثر و بیشتر عظیم الشان

دینی درسگاہیں ان ہی کے خلفاء اور متوسّلین نے قائم کی ہیں! ـــــــ الغرض ان کی ذات سے جو 'خیرِ کثیر' برِّصغیر پاک وہند میں پھیلا وہ اظہر من الشمس ہے تاہم راقم کے نزدیک ان کا شمار "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" میں نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ گذشتہ شمارہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

بیہقیٔ وقت مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا سیّد محمد یوسف بنّوریؒ کا مزاج بھی بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی بلکہ تعلیمی و تدریسی تھا! اہلِ علم کے حلقے میں تو وہ یقیناً بہت پہلے نمایاں اور معروف ہو گئے ہوں گے ـــــ لیکن عوامی سطح پر ان کی شہرت سنہ ۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت سے پہلے زیادہ تر صرف کراچی اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھی ـــــ البتہ سنہ ۷۴ء کی تحریک کے دوران وہ دفعتاً ملک گیر شہرت کے حامل ہو گئے ـــــ راقم کو ان سے جو ذہنی و قلبی تعلق رہا اس کی اجمالی داستان الحمدللہ کہ ان کی وفات پر سپردِ قلم ہو گئی تھی اور 'میثاق' کی نومبر ۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہو گئی تھی جو ذیل میں نقل کی جا رہی ہے! (اگر راقم آج یہ باتیں لکھتا تو شاید بعض حضرات اسے 'سخن سازی' قرار دیتے!)

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَم

آہ مولانا محمّد یُوسف بنوریؒ

"اس دارِ فانی میں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کے انتقال سے ایک دم ایک مہیب خلا پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے اور ایک بار تو دنیا واقعۃً اندھیری ہو جاتی ہے ـــــ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی وفاتِ حسرت آیات یقیناً اسی زمرے میں ہے! اور اس سے پورے عالمِ اسلام اور بالخصوص پاکستان کے دینی و علمی حلقے میں جو خلا پیدا ہوا ہے' اس کے پُر ہونے کی کوئی صورت بظاہر احوال تو دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔

راقم الحروف   میں لگ بھگ چھ ماہ اور پھر سنہ ۶۲ء تا سنہ ۶۵ء تقریباً چار سال کراچی میں مقیم رہا' اور اس دوران میں اکثر جمعے جامع مسجد نیوٹاؤن ہی میں ادا ہوئے اور

اس طرح مولانا کے اقتدار کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی اور مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کے تعمیر و ترقی کے مراحل بھی "وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ" کے مانند نگاہوں سے گزرتے رہے، جس سے مولانا کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوتا چلا گیا۔ محبِ مکرم ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی (کیماڑی، کراچی)[1] ان دنوں مولانا سے باقاعدہ دورۂ حدیث میں شامل ہو کر استفادہ کر رہے تھے اور ساتھ ہی کچھ علاج معالجے کی خدمت بھی بجا لاتے تھے۔ اس دوران میں ان کے ساتھ مولانا سے چند بار ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا لیکن زیادہ تر رسمی اور سرسری انداز میں[2]

اکتوبر، نومبر ۶۶ء کے دوران رمضانِ مبارک کا پورا مہینہ راقم کو مدینہ منورہ میں بسر کرنے کی سعادت ملی تھی۔ آخری عشرے میں مولانا بنوریؒ بھی تشریف لے آئے تھے اور مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ لہٰذا وہاں چند تفصیلی ملاقاتوں کا موقع میسّر آیا۔ راقم نے اپنا کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" مولانا کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ اور کوئی غلطی ہو تو متنبہ فرما دیں تاکہ اصلاح کر لی جائے ـــــ مولانا نے اسے بالاستیعاب دیکھا اور ایک مقام پر عبارت میں اصلاح فرمائی ـــــ (جو اگلے ایڈیشن میں کر دی گئی!)[3]

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۷۷ء کی ہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے جو انداز اختیار کیا اس کے باعث اب راقم کا کوئی ربط و ضبط ان سے نہیں ہے!

[2] تاہم ان سرسری ملاقاتوں میں بھی مولاناؒ سے جو قرب ذہنی و قلبی پیدا ہو گیا تھا اس کا مظہر ہے کہ جب راقم نے ۶۶ء میں "میثاق" کی ادارت سنبھالی تو مولاناؒ کی ایک تحریر مئی ۶۷ء کے شمارے میں شائع کی ـــــ اور "حُرمتِ صحابہؓ" کے عنوان سے ایک طویل مضمون اپریل مئی ۶۷ء کے مشترک شمارے میں شائع کیا ـــــ! حضرت مولاناؒ کی یہ دونوں تحریریں نہایت اہم ہیں۔ اور ان شاء اللہ 'میثاق' کی قریبی اشاعتوں میں دوبارہ شائع کی جائیں گی۔

[3] راقم کی اصل عبارت یوں تھی:-

"لیکن پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم و فنون حاصل کئے ہوں۔ مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں۔ اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو ان کی یہ تلاوت نہ صرف یہ کہ بے کار اور لاحاصل ہو گی (باقی اگلے صفحہ پر)

عید الفطر کے روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا - راقم مولانا کی خدمت میں غالباً بخاری حضرات کی رباط میں حاضر ہوا - راقم کی اس درخواست پر کہ اسے کچھ علیحدگی میں عرض کرنا ہے' مولانا نے فوراً تخلیہ کا اہتمام فرمایا - تب راقم نے عرض کیا کہ " مجھے تشویش لاحق ہے کہ مسجدِ نبویؐ میں تو دل بھی لگتا ہے اور انشراحِ صدر و انبساط کی کیفیت بھی نصیب ہوتی ہے' لیکن مسجدِ حرام میں قطعاً دل نہیں لگتا ! " یہ سنتے ہی مولانا پر رقّت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے فرمایا " ڈاکٹر صاحب ! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی دینی و روحانی الجھن کا ذکر کیا ہے ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دُنیوی معاملات کا ہی کا رونا روتے آتا ہے ! " ـــــــ راقم مولانا کے اس شدّتِ احساس سے حد درجہ متأثر ہوا اور یہ واقعہ راقم اور مولانا کے مابین ایک قریبی قلبی تعلق کی تمہید بن گیا ـ

۷۲ء کے دوران راقم ہر ماہ کراچی جاتا رہا اور گاہے گاہے مولانا کی زیارت سے مشرف بھی ہوتا رہا - اسی زمانے میں ایک بار مولانا نے اپنے دورۂ حدیث کے طلبہ سے خطاب کا موقع بھی عنایت فرمایا اور اگرچہ راقم مولانا کی موجودگی اور ان کے رعبِ علمی کے باعث کچھ کھل کر بات نہ کرسکا اور اس نے اعتراف بھی کیا کہ : میری حالت اس وقت وہی ہے جس کا نقشہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ : " يَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنطَلِقُ لِسَانِي ! " تاہم راقم نے جس طرح بھی بن پڑا " اسلام کی نشأۃِ ثانیہ " کے موضوع پر گفتگو کی جس کی مولانا نے کھلے دل کے ساتھ تصویب فرمائی ـ انہی دنوں مولانا نے یہ محبت آمیز پیشکش بھی فرمائی کہ " جب بھی کراچی آنا ہو ' مدرسے ہی میں قیام کیا کرو ' تمہارے لئے ایک بالکل علیحدہ کمرہ مخصوص کردیا جائے گا ! " ـــــــ راقم کے لئے مولانا کی اس مشفقانہ پیشکش سے فائدہ اٹھانا تو بوجوہ ممکن نہ ہوسکا تاہم دل پر ان کی ان شفقتوں کا بے حد

(تسلسل) ، بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں ! "

جسے مولاناؒ نے بدل کر یوں کردیا :

" .... اگر قرآنِ مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے ! "

اس طرح الحمدللہ کہ میری مراد بھی اور زیادہ واضح ہوگئی اور محض لفظی بے احتیاطی کے باعث منکرینِ حدیث سے جو مشابہت پیدا ہورہی تھی اس کا بھی ازالہ ہوگیا - !

اثر ہوا اور قلب میں مولانا کی عظمت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ محبت بھی جاگزیں ہوگئی۔

وسطِ دسمبر ۱۹۷۳ء میں پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تو راقم نے مولانا کو اس میں شرکت کی دعوت دی جسے انہوں نے کمال شفقت سے قبول فرمالیا۔ چنانچہ حسبِ وعدہ تشریف لائے[۴] اور دو دن راقم کے غریب خانے ہی پر رونق افروز رہے۔ اس دوران ان کی سادگی اور بے تکلفی کا جو تجربہ ہوا اس سے بھی دل بہت متأثر ہوا ـــــ اور ان کا یہ طرزِ عمل تو بہت ہی 'غیر معمولی' نظر آیا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ آمد و رفت کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جب انجمن خدام القرآن کی کچھ مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کی گئیں تو ان کی قیمت بھی باصرار ادا فرمائی[۵]

۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو راقم نے مولانا کو اس کے 'حلقۂ مستشارین' میں شرکت کی دعوت دی تو فرمایا "ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے بیحد عزیز ہیں، آپ کو پوری آزادی ہے کہ جب چاہیں آئیں اور جو مشورہ چاہیں طلب کریں، میں کبھی دریغ نہ کروں گا لیکن کوئی باضابطہ ذمّہ داری قبول کرنے سے میں اپنی صحت کی کیفیت اور مصروفیت کی شدّت کے باعث معذور ہوں!" ـــــ اس کے بعد ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی جو راقم دسمبر ۷۴ء کے 'میثاق' میں نقل کرچکا ہے اور اس وقت اس کے اعادے کی نہ ضرورت ہے، نہ افادیت![۶]

---

۴ راقم الحروف کو ۱۷ دسمبر ۱۹۷۳ء کی اس شام کی کیفیات ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں۔ جب مولاناؒ نے 'مقامِ رسالتؐ' پر اپنی عالمانہ اور جذبہ انگیز تقریر فرمائی تھی۔ جناح ہال نہ صرف یہ کہ خود پوری طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ اس کی تمام گیلریاں بھی انسانوں سے پُر تھیں، راقم نے مولاناؒ کی تقریر کے بعد عرض کیا تھا کہ ـــــ

"میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر آج پوری طرح سمجھ میں آیا ہے کہ ؎

"بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!"

اہالیانِ لاہور میں سے اکثر کے لئے مولاناؒ سے یہ پہلے تعارف کا موقع تھا ـــــ اور اکثر و بیشتر لوگوں کے چہروں پر ایک خوش گوار حیرانی کا تأثر نمایاں تھا!

۵ ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختم نبوّت اور اس کی نہایت شاندار کامیابی کے ضمن میں ایک طویل اداریہ راقم نے اکتوبر نومبر ۷۴ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا جس میں اس کی کامیابی کا ایک اہم سبب حضرت مولاناؒ کی قیادت و سیادت کو قرار دیا تھا۔ راقم کا احساس ہے کہ یہ پورا اداریہ موجودہ حالات کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے چنانچہ اسے بھی ان شاء اللہ من وعن 'میثاق' کی کسی قریبی اشاعت میں دوبارہ شائع کر دیا جائے گا!

۶ حضرت مولاناؒ کی بقیہ بات یہ تھی "........ ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد افسوس ہے کہ مولانا سے صرف چند سرسری ملاقاتیں ہی ہو سکیں۔ جن میں سے ایک میں مولانا نے دسمبر ۷۶ء کے متذکرہ بالا مضمون کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا اور اپنی دو تازہ عربی تالیفات بھی عنایت فرمائیں، جن میں سے ایک میں بعض وہی موضوعات زیر بحث آئے تھے جن پر راقم نے اپنی مذکورہ تحریر میں اظہارِ رائے کیا تھا ـــــ غالباً اسی موقع پر راقم نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا یہ درست ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بارے میں فرمایا تھا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا؟" تو مولانا نے اس کی توثیق فرمائی اور مزید ارشاد فرمایا کہ: اس سے ایک طرف تو حضرت شیخ الہندؒ کے تواضع و انکسار کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف چھوٹوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا۔"

راقم الحروف کے لئے یہ بات تازندگی رنج و غم کا باعث رہے گی کہ ماہنامہ "بیّنات" کا جو غالباً آخری شمارہ مولانا کے اداریے کے ساتھ شائع ہوا ہے اس میں مولانا نے راقم کی ایک تحریر کے بعض مقامات پر گرفت فرمائی اور راقم سوچتا ہی رہ گیا کہ حاضرِ خدمت ہو کر بالمشافہ وضاحت پیش کرے یا تفصیلی خط لکھے کہ خبر آگئی کہ مولانا نے راولپنڈی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ ـــــ ویسے جن حضرات سے بھی مولانا کی اس گرفت کے بارے میں بات ہوئی وہ گواہی دیں گے کہ راقم کو اس سے ہرگز کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ جہاں تک "گرفت" کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو راقم کو یقین تھا کہ اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے اور جیسے ہی راقم وضاحت پیش کرے گا، مولانا یقیناً تسلیم فرمالیں گے، اور جہاں تک محبت و شفقت کا تعلق ہے تو وہ مولانا کی اس تحریر سے بھی ٹپک رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے لئے مولانا کے قلم سے "آں محترم" کے الفاظ دیکھ کر تو اپنے آپ میں ایک شرمندگی کا سا احساس بھی ہوا ـــــ البتہ حسرت ہے تو صرف اس کی کہ کاش مولانا سے ملاقات ہو جاتی اور

(تسلسل) اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلّم اوّل امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحرِ ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے۔!" ـــــ راقم نے اس وقت اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ راقم کا ربط و تعلق کم ہوتے ہوتے معدوم کے درجے میں آچکا تھا؛ چنانچہ دسمبر ۷۶ء کے "میثاق" میں راقم نے مولانا سے اپنے تعلقات کے انقطاع کا اعلان بھی کر دیا تھا ـــــ!!

راقم خود ان ہی کو گواہ بنا تا کہ :

○ راقم کو نہ مفسّر بننے کا کوئی شوق ہے![7]

○ نہ ہی وہ جہنّم سے نجات پا جانے کو ادنیٰ درجہ کی کامیابی متصوّر کرتا ہے!

○ نہ اس کا کسی بھی درجہ میں کوئی تعلق "خارجیت" سے ہے اس لئے کہ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو ہرگز کافر نہیں سمجھتا ــــ اور اس دنیا میں کسی کے ایمان کے فیصلے کا دار و مدار عمل پر نہیں صرف "قول" پر سمجھتا ہے![8]

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات "غلط فہمی" کے لفظ سے مغالطے کا شکار ہو جائیں، اس میں ہرگز کوئی دخل مولانا کے سوءِ فہم کو حاصل نہیں۔ یہ تو ثابت ہی ہے کہ مولانا نے راقم کی متعلقہ تحریر "انجمن خدام القرآن" کے طبع کردہ کتابچے "راہِ نجات: سورۃ والعصر کی روشنی میں" میں نہیں پڑھی بلکہ "ادارہ اشاعتِ علومِ اسلامیہ، چہلیک، ملتان" کے ماہانہ سلسلۂ مطبوعات کے شمارہ نمبر ۴۴ میں "انسان کا اصل سرمایہ" کے عنوان سے مطبوعہ رسالے میں پڑھی جس میں نہ صرف یہ کہ اس کا اوّل و آخر غائب ہے بلکہ راقم کا نام بھی "ڈاکٹر اسرار محمد خاں" درج کیا گیا ہے۔ ثانیاً اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس تحریر کے بعض مقامات نشان زد کر کے مولانا کے سامنے رکھ دیئے اور مولانا نے اس پر رائے رقم فرما دی، واللہ اعلم !!

---

[7] چنانچہ واقعہ ہے کہ راقم نے بیسیوں مرتبہ اس فرمائش کے جواب میں کہ آپ بھی تفسیر لکھیں یہی عرض کیا کہ نہ تو راقم اس کا اہل ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس لئے کہ بحمد اللہ اردو زبان میں درجن بھر کے لگ بھگ عمدہ تفاسیر موجود ہیں۔ میں تو اس کوشش میں ہوں کہ ان کے پڑھنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں! ــــ بلکہ ایک مرتبہ تو ایک کرم فرما مُصر ہوئے کہ اچھا صرف قرآن مجید کا ترجمہ کر دو، میں اسے فوراً شائع کر دوں گا ــــ اور اس خدمت کے عوض انہوں نے ایک خطیر رقم کا لالچ بھی دیا ــــ اور میری حوصلہ افزائی کے لئے یہ بھی کہا کہ اس میں محنت کچھ درکار نہیں، دو چار ترجمے سامنے رکھ کر ترجمہ کر دیں، صرف آپ کا نام درکار ہے، ان شاء اللہ بہت نسخے فروخت ہوں گے ــــ جس پر راقم نے دل میں لاحول پڑھی اور ان سے مناسب الفاظ میں معذرت کر دی۔

[8] اس مسئلے پر راقم ان شاء اللہ آئندہ تفصیلی گفتگو کرے گا۔

بہرحال راقم الحروف کے نزدیک مولانا کے ساتھ کم وبیش سات سالہ تعلقات کی انتہائی خوشگوار یادوں کے آخر میں اگر ایک ذرا سی تلخ یاد بھی شامل ہوگئی تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اس تلخی میں بھی محبت وشفقت کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا کو ہماری دعاؤں کی ہرگز کوئی حاجت نہیں لیکن ان کے لئے دعا خود ہمارے لئے یقیناً اجر وثواب کا ذریعہ ہے ــــــ

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ اَعْلٰی عِلِّیِّیْنَ ۔ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ!"

یہ ایک امرِ مُسلّم ہے کہ اللہ والوں کا اصل ترکہ ــــــ اور عظیم ترین صدقۂ جاریہ صالح اولاد ہوتی ہے، راقم کا حضرت مولانا بنوریؒ کے صاحبزادے مولانا محمد بنوری سے مولاناؒ کی وفات کے بعد بہت ہی کم ملنا ہوا لیکن چونکہ انہوں نے مولاناؒ کی مجھ پر شفقت وعنایت کا مشاہدہ کیا ہوا ہے لہٰذا وہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں! ــــــ پھر داماد بھی بیٹوں ہی کے حکم میں ہوتے ہیں، چنانچہ مولاناؒ کے خویشِ کلاں مولانا محمد طاسین مدظلہٗ کی راقم پر عنایتوں اور شفقتوں کا حال تو سب کے علم میں ہے ہی، ــــــ شاید بعض حضرات کے علم میں یہ نہ ہو کہ وہ 'تنظیم اسلامی' کے حلقۂ مستشارین میں بھی باضابطہ شامل ہیں!

مولانا بنوریؒ کا دوسرا عظیم صدقۂ جاریہ "جامعۃ العلوم الاسلامیہ" ہے جس کی ایک ایک اینٹ پر مولانا کے عزمِ مصمم اور محنت ومشقت کے نقوش اسی شان کے ساتھ ثبت ہیں جو نعیم صدیقی صاحب کے ان اشعار میں سامنے آتی ہے ؎

ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرّے! ہماری آرزوؤں کے مزارات!
ہیں ہر ذرّے کی پیشانی پر منقوش ہمارے عزم کے خونیں نشانات

اس جامعہ کا ماہانہ مجلّہ 'بیّنات' بھی مولاناؒ ہی کا صدقۂ جاریہ ہے، جس کے "بصائر وعبر" کے صفحات سالہا سال تک ان ہی کے رشحاتِ قلم سے مزیّن ہوتے رہے ــــــ اور جس کی ادارت ان کی وفات کے بعد مولانا محمد یوسف لدھیانوی کے سپرد ہوئی جو مولاناؒ کو اپنا "شیخ اور مربّی" بھی قرار دیتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم نامی کی اضافی نسبت بھی رکھتے ہیں۔

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم الحروف کا تذکرہ پہلی بار آج سے پورے اٹھارہ برس قبل راقم کی تالیف 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا جو فروری ۶۷ء کے

"بیّنات" میں شائع ہوا تھا اور جس کے کُل چار میں سے تین صفحات مولانا نے جنوری ۸۵ء کے "بصائر و عبر" میں بطور اقتباس شائع کیے ہیں۔ ان میں راقم کے بارے میں یہ الفاظ تو شامل ہیں کہ "ہماری رائے میں (جو اگر غلط ہو تو حق تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں) مصنّف نے جماعت کی "بنائے فساد" کی تشخیص صحیح فرمائی ہے........" اور "........جس کی شکایت بڑے درد مند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے"۔ لیکن نہ معلوم کیوں ان جملوں کے نقل سے مولانا نے احتراز فرمایا ہے کہ "تاہم ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا تو ایک ایک جملہ ان کے اخلاص اور خیر خواہی کی شہادت دیتا ہے!" اور "ہم مصنّف سلمہ، کے قلم کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے پیچیدہ مسائل و مراحل میں بھی متانت، رزانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا!"

تاہم یہ تو غیر اہم بات ہے۔ راقم کے نزدیک اس تبصرے میں شامل اہم تر امور یہ ہیں کہ:

(۱) ۱۹۶۷ء تک مولانا لدھیانوی مولانا مودودی مرحوم کی نیک نیتی کی کرامت کے قائل تھے اور

(۲) مولانا مودودی سے مولانا لدھیانوی کو اصل شکایت یہ تھی کہ انہوں نے "اپنے نظریات اور افکار کے گرد "انا اعلم" کا حصار کھینچ لیا!" مولانا کی مکمل عبارت یوں ہے:

"اس لئے ہمیں اس پر قطعاً تعجب نہیں، کہ مولانا کی تحریک میں غلطیاں کیوں پیدا ہوتی گئیں۔ بلکہ حیرت اور تعجب اس بات پر ہے کہ اتنی کم غلطیاں ہی کیوں پیدا ہوئیں، اور وہ اپنے خود رو مطالعہ کے نتیجے میں، اہلِ حق سے نسبتاً قریب کیسے رہ گئے۔ دوسرے لوگ نہ معلوم اس کی کیا توجیہہ کریں، لیکن مجھے تو یہ مولانا کی نیک نیتی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔

اور عجلت پسندانہ بے اصولی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا، جبکہ مولانا نے اپنے نظریات و افکار کے گرد "انا اعلم" کا حصار کھینچ لیا، ان کی کسی غلطی پر جب کبھی تنبیہہ کیجاتی تو انہوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ تنبیہہ کتنے بڑے فاضل، فقیہہ اور خدا ترس کی جانب سے کی گئی ہے۔ اسے "لائقِ توجہ نہیں" کہہ کر دل و دماغ کے تمام راستے بند کر لئے، ورنہ جب وہ غیر تربیت یافتہ ذہن کے باوصف اسلامی تحریک کی سربراہی کر رہے تھے، اگر اس دوران بھی وہ اہلِ صلاح و تقویٰ، اور اصحابِ علم و فضل کی ہدایت پر کان دھرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جماعت بالآخر اس سطح پر آجاتی جس کی شکایت بڑے درد مند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے۔"

(ماہنامہ "بیّنات"۔ شوال ۱۳۸۶ھ)

ہمیں مولانا لدھیانوی کی ان آراء سے کامل اتفاق ہے ـــــ بلکہ ہم انہیں اس وسعتِ قلب پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے ـــــ لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو یہ عرض کرنے پر بھی مجبور پاتے ہیں کہ کاش! مولانا اسی وسعتِ قلب کا مظاہرہ اس خاکسار کے حق میں بھی کر سکتے جسے "انا اعلم" تو کجا "عالم" ہونے کا بھی دعویٰ نہیں، اور جو علماءِ کرام کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے ـــــ بہرحال اس موضوع پر کسی قدر گفتگو آگے ہوگی!

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم کا دوسری بار ذکر آج سے تین سال قبل خواتین کے مسئلے پر راقم کے ایک اخباری انٹرویو پر مغرب زدہ خواتین کے احتجاجی جلوس پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا ـــــ اور اس میں الحمدللہ کہ ملک بھر کے تمام دینی جرائد کے ساتھ ساتھ مولانا لدھیانوی نے بھی راقم کے موقف کی پوری تائید و تحسین فرمائی تھی اور ایک نہایت عمدہ تحریر اسلام میں عورت کے مقام اور مرتبہ کے موضوع پر سپردِ قلم کی تھی۔ (مولانا تقی عثمانی صاحب کا اداریہ بھی اس موضوع پر بہت زوردار تھا اور انہوں نے بھی راقم کی قرآنی حقائق کی تعبیر کی توثیق و تحسین فراخدلانہ انداز میں فرمائی تھی)۔

اس کے بعد نہ معلوم کیوں مولانا لدھیانوی کے قلم نے راقم کے خلاف مخالفانہ انداز اختیار فرمالیا۔ یہ معاملہ اگر اس طرح ہوتا کہ مولانا نے راقم کی علمی و فکری لغزشوں پر پے بہ پے ٹوکا ہوتا، اور اس کی اختیار کردہ دینی تعبیرات کی غلطیوں پر تنبیہہ کی ہوتی جس پر راقم نے مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی ہوتی اور اس کے نتیجے میں مولانا کے طرزِ عمل میں وہ تبدیلی رونما ہوتی تو ہمیں شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا ـــــ لیکن صورتِ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ آج تک مولانا نے راقم کی کسی علمی یا فکری غلطی کی نشاندہی نہیں فرمائی (صرف ایک بار مجلس احرار اسلام اور ۱۹۵۳ء کی ختم نبوت کی تحریک کے بارے میں راقم کے بعض غیر محتاط الفاظ پر گرفت فرمائی تھی جس کی پوری وضاحت راقم نے تحریراً بھی کر دی تھی اور حاضرِ خدمت ہو کر بالمشافہ بھی کر دی تھی جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار فرما دیا تھا!) لیکن جنوری اور فروری ۱۹۸۵ء کے شماروں میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" کے پیشِ نظر راقم کو جو مشورہ دیا

اس کا حاصل یہ بنتا ہے کہ راقم اپنی جملہ سرگرمیوں اور دینی خدمات کی بساط لپیٹ کر رکھ دے ہم مولانا کے اس مشورہ کو بھی ان کے خلوص و اخلاص ہی پر محمول کر کے سکوت اختیار کرتے اگر انہوں نے بعض صریح زیادتیاں اپنی اس تحریر میں نہ کی ہوتیں۔

ان میں سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہے کہ مولانا نے راقم کے کتابچے 'راہِ نجات: سورہ والعصر کی روشنی میں' پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا تنقیدی و تنبیہی تبصرہ تو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے لیکن اس پر جو وضاحت راقم نے 'میثاق' میں شائع کی تھی (جو اوپر درج کی جا چکی ہے) اس کا تذکرہ تک نہیں کیا! ——— اس ضمن میں یہ بات تو ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہے کہ اُس وقت بھی راقم کی وضاحت مولانا لدھیانوی ایسے بیدار و ہوشیار اور محنتی شخص کی نظر سے نہ گذری ہو ——— البتہ یہ عین ممکن ہے، اور ہم یہی حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ کہ اِس وقت وہ ان کی یادداشت میں محفوظ نہ رہی ہو اگرچہ یہ بات بھی ان کے منصب کے شایانِ شان نہیں، گویا معاملہ وہی ہے کہ

ان کنت لا تعلم فھذا مصیبۃ
وان کنت تعلم فالمصیبۃ اعظم

بہرحال اب جبکہ حضرت مولانا بنوری کا رقم کردہ وہ شذرہ 'بیّنات' ایسے وقیع مجلّے میں دوبارہ شائع ہو گیا ہے تو اپنی سابقہ وضاحت پر مستزاد عرض ہے کہ:

۱۔ اس معاملہ کا تعلق اصلاً تو اس حقیقت سے ہے کہ فقہ و قانون اور قضاء و افتاء کی زبان اور دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت اور اخلاقی تلقین کے لئے ترغیب و ترہیب کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اصلاً اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مخالفین نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بعض عبارتوں پر طوفان سے کھڑے کر دیئے۔ جس کا تلخ ترین تجربہ پورے حلقۂ دیوبند کو ہے، ——— بلکہ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو خود قرآن حکیم اور فرمودات نبی کریمؐ پر 'تضاد' کا الزام عائد ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن اخلاقی و روحانی سطح پر عفو و درگذر کی تلقین کرتا ہے لیکن قانونی و دنیوی نظام کی مصلحتوں کے پیشِ نظر قصاص کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر تلقین کرتا ہے کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اللہ کی راہ میں دے دو ——— !

(یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ) اور دوسری طرف وراثت کا تفصیلی قانون بھی بیان کرتا ہے اور زکوٰۃ کی تلقین بھی کرتا ہے جس کے نصاب اور مقادیر کا معاملہ سنّتِ رسولؐ نے معیّن فرمادیا ہے! (معلوم ہے کہ اسی اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اشتراکی اس آیۂ مبارکہ کو اپنی تائید کے لئے استعمال کرتے ہیں!)

۲۔ ثانیاً اس کا تعلق 'ایمان' کی تعریف سے ہے جس میں امّت کی دو عظیم ترین ہستیاں بظاہر متضاد موقف رکھتی ہیں۔ چنانچہ فقیہہ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا مشہور موقف یہ ہے کہ "الایمانُ قولٌ لَایَزِیْدُ وَلَایَنْقُصُ!" جبکہ محدّثِ اعظم امام بخاریؒ کا قول ہے کہ "الایمان قولٌ وعملٌ یزید وینقص!" ——— ان بظاہر متضاد اقوال کے مابین تطبیق کی حسین ترین صورت یہ ہے کہ پہلی تعبیر اس فقہی اور قانونی ایمان کی ہے جو اس دنیا میں معتبر ہے اور جس کی بنا پر کسی شخص کے مسلم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے جبکہ دوسری تعبیر اس حقیقی ایمان کی ہے جو آخرت میں معتبر ہوگا ——— اور دونوں ہی تعبیریں اپنی اپنی جگہ صد فی صد درست ہیں! ——— چنانچہ اس حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھنے کے باعث خطرناک ٹھوکریں کھائیں ایک جانب خوارج، معتزلہ اور اہلِ تشیّع نے اور دوسری جانب 'مُرجئہ' نے!

اور یہی حقیقت ہے جس سے وہ ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے جو ایمان کے مسئلے میں قرآنِ حکیم کی بعض آیات میں سامنے آتا ہے مثلاً سورۂ نساء (آیت نمبر ۹۴) میں ارشاد ہوتا ہے کہ "جب تم جہاد کے لئے نکلو تو تحقیق کرلیا کرو اور جو شخص تم پر سلام (سلامتی یا اسلام) پیش کرے اس سے یہ مت کہا کرو کہ تم مومن نہیں ہو!" اور سورۂ حجرات (آیت نمبر ۱۴) میں بعض بدوؤں کے دعویٔ ایمان کو رد کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے "تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے)" یہاں ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں لفظ 'مومن' قانونی اور شرعی و فقہی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کے لئے دوسری آیت میں 'اسلام' کی اصطلاح اختیار فرمائی گئی ہے اور "ایمان" کا لفظ حقیقت اور قلبی ایمان کے لئے مختص کردیا گیا ہے (یہی وجہ ہے کہ اسی آیت میں مزید وضاحت فرمائی گئی ان الفاظ میں کہ "ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا!") اسی بات کو آنحضورؐ نے حدیثِ معاذ ابن جبلؓ میں اس طرح واضح فرمایا کہ کلمۂ شہادت، اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے ذکر کے بعد فرمایا کہ "فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدْ

اعْتَصَمُوا وَعَصَمُوا دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ"
یعنی جب وہ یہ تین شرطیں پوری کر دیں تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے (یعنی ان کا اسلام قبول کر لیا جائے گا) باقی رہا نیتوں کا معاملہ تو اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے (یعنی یہ معاملہ دنیا میں زیر بحث نہیں آئے گا اور اس کی بنیاد پر کوئی قانونی فیصلے یا اقدامات نہیں ہوں گے)

اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو اگرچہ بہت سی احادیث میں 'ایمان' اور 'اسلام' کو جداگانہ حقیقتوں کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے تاہم انسان بہت سی احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بھی تضاد کے سوءِ ظن میں مبتلا ہو سکتا ہے، مثلاً ایک جانب 'ترہیب' اور تنبیہ و تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ "خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں"! پوچھا گیا کون؟ تو ارشاد فرمایا "جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی چین میں نہ ہو!" ——— اور دوسری جانب 'ترغیب' اور دلدہی اور حوصلہ افزائی کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ "اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور برا کام کر کے افسوس ہو تو تم مومن ہو!"

بہرحال جیسے کہ پہلے نقل ہو چکا ہے راقم کا موقف یہ ہے کہ:

> میں اس دنیا میں کسی کے دعوئ اسلام و ایمان کی قبولیت کا دارومدار صرف اس کے قول کو قرار دیتا ہوں۔ عمل کی بنیاد پر کسی کے دعوئ اسلام و ایمان کو رد کر دینا درست نہیں سمجھتا، چنانچہ میرے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ تکفیر کی صرف ایک صورت درست ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام کی کسی بنیادی بات (جیسے مثلاً ختمِ نبوت) کا انکار کر دے یا اس کی ایسی تعبیر کرے جو انکار کو مستلزم ہو! ——— رہا آخرت کا معاملہ تو وہ اللہ کے حوالے ہے، وہ "عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" ہے۔ چنانچہ اپنے علم کامل کی اساس پر فیصلہ کرے گا۔ البتہ اصولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف وہی ایمان معتبر ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں "تصدیقٌ بالقلب" یعنی دلی یقین کے ساتھ ہو اور اس مرتبہ پر اعمالِ صالحہ بھی ایمان کے ذیل ہی میں آجاتے ہیں!!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، راقم کو یقین ہے کہ اگر وہ یہ وضاحتیں مولانا بنوریؒ کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ یقیناً قبول فرما لیتے ——— بلکہ راقم اپنا یہ کتابچہ بھی ان کی خدمت میں پیش

کر دیتا کہ اس میں جہاں جہاں کسی لفظی بے احتیاطی کے باعث کوئی مخالف مفہوم متبادر ہوتا ہو تو اصلاح فرما دیجئے! ـــــ اور راقم کو یقین ہے کہ مولانا کی اصلاح سے میرا مفہوم زیادہ نکھرتا! (جس کی مثال "قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچے کے ضمن میں پہلے گذر چکی ہے) ـــــ بہرحال اب بھی اگر مولانا لدھیانوی اس کتابچے کے بالاستیعاب مطالعہ کی تکلیف گوارا فرما کر ایسے مقامات کی نشاندھی فرمائیں تو وہ ان شاءاللہ راقم کو کسی ضد میں مبتلا نہ پائیں گے۔

سورۃ العصر کے بارے میں راقم نے جو یہ لکھا کہ "یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجے میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے" تو اس میں صرف اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کی جانب اشارہ ہے کہ اس میں اصل زور ہے "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" پر جس سے نجات کا ذکر ایک استثناء کے طور پر ہے، بمقابلہ سورۃ التین کے کہ اس میں اصل زور ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" پر اور ثانیاً آخر میں ذکر صرف نجات کا نہیں بلکہ مثبت طور پر "فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ" کی نوید جانفزا ہے۔ گویا سورۃ العصر پر رنگ غالب ہے "انذار" کا اور سورۃ التین پر رنگ غالب ہے "تبشیر" کا (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو 'راہِ نجات' کے نسخۂ کلاں کے صفحات ۸ تا ۱۰) ـــــ اسی طرح ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شے کا اپنی جگہ حقیر یا وقیع ہونا اور ہے اور کسی دوسری چیز کے مقابلے میں کم تر یا برتر ہونا اور! ـــــ چنانچہ لاکھ اپنی جگہ بہت ہے لیکن کروڑ کے مقابلے میں بہت کم! ـــــ اسی طرح محض جہنّم سے چھٹکارا پا جانا بھی اگرچہ اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن جنّت کے اعلیٰ مقامات کے مقابلے میں تو خود اس کے ادنیٰ درجات بھی کم تر ہوں گے (جس کی نسبت و تناسب کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے حضورؐ کے ان الفاظِ مبارکہ سے کہ: ایک کم تر درجہ کا جنّتی اپنے سے اوپر والے درجہ کے جنّتی کو اس طرح دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ (راد کما قال صلّی اللہ علیہ وسلّم) کجا محض جہنّم سے چھٹکارا پا جانا!! ـــــ یہ تقریر چونکہ راقم نے ایچی سن کالج کے طلبہ کے سامنے کی تھی لہٰذا اس میں ان کے ذہن کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ایک طالب علم کے نزدیک محض تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو جانا بھی کتنی بڑی کامیابی ہے یہ اس سے پوچھئے جو فیل ہو گیا ہو!

رہی یہ بات کہ "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ـــــ کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی

بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو!" تو یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو خود راقم نے نجات کی راہ، کے نسخۂ کلاں کے صفحات ۲۸ تا ۳۱ تک لکھی ہے جس کے دو مختصر حصے درجِ ذیل ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم صلاح و فلاح کے جس راستے کی جانب رہنمائی کرتا ہے یہ چار چیزیں (یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر) اس کے لئے بمنزلہ اساس کے ہیں۔۔۔۔۔۔ پھر جس طرح ایمان کے ابتدائی مراحل سے لے کر صدیقیت کے مقام تک بے شمار مدارج ہیں (اسی طرح) عمل صالح موٹے موٹے اعمال سے شروع ہو کر ایک گھنے اور پاٹ دار درخت کی طرح انسانی زندگی کے جملہ اطراف حتّٰی کہ اس کے بعید ترین گوشوں Remote Corners تک پر محیط ہو جاتا ہے۔"

"لیکن اگر کسی انسان کی شخصیت کو کوئی اخلاقی یا روحانی بیماری گھن کی طرح کھا چکی ہو تو لازم ہے کہ ایمان کا تخم جب اس کی کشتِ قلب میں جم کر پھوٹے تو اس سے عملِ صالح اور تواصی بالحق کی متناسب اور متوازن شاخیں نمودار ہوں۔"

مولانا لدھیانوی کی دوسری زیادتی ان کا استہزائیہ انداز ہے۔ جو کسی اخبار کے فکاہی کالموں یا ادبی جرائد کے مزاج سے تو مناسبت رکھ سکتا ہے، دینی جرائد اور ان کے بھی اداراتی صفحات کے شایانِ شان ہرگز نہیں ؎ "ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را" چنانچہ انہوں نے اپنی طویل تحریر کا اختتام تو ان الفاظ سے کیا ہے کہ "آخر میں یہ گذارش کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کی شان کے خلاف کوئی بات نکل گئی تو اس پر پیشگی (؟) معذرت کا طالب ہوں"۔۔۔۔۔ لیکن خود اس جملے میں "شان" کے لفظ کی استہزائی شان سے قطع نظر پوری تحریر میں جا بجا طعن و طنز کا انداز موجود ہے۔۔۔۔ مثلاً:

۱۔ "انہوں نے 'تنظیم اسلامی' کے نام سے اپنے مداحوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے!"

۲۔ "موصوف کو شکایت ہے کہ علماءِ کرام نہ صرف یہ کہ ان کے مبارک سلسلہ سے تعاون نہیں کر رہے بلکہ۔۔۔۔۔۔"

۳۔ جبکہ ٹیلیویژن پر ان کے "الھدیٰ" کا غلغلہ بلند ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں پڑھے لکھے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کو سعادت سمجھ رہے ہیں"۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب تو اپنی فتوحات پہ نازاں ہیں اور........'

۵۔ "اس جہاد کے لئے انہوں نے 'تنظیم اسلامی' تشکیل دیکر 'سفرِ قیادت' کا آغاز کر دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چشم بد دور انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح 'سلسلۂ بیعت' بھی جاری فرما دیا ہے (جسے 'سلسلۂ عالیہ احمدیہ' کے مقابلے میں 'سلسلۂ عالیہ اسراریہ' کہنا موزوں ہو گا" (اس پہ حاشیہ میں ایک وضاحتی نوٹ ہے: "تشبیہ نفسِ بیعت میں ہے گو نوعیت کا اختلاف ہو")

اس ضمن میں راقم نہایت ادب کے ساتھ مندرجہ ذیل گزارشات کی اجازت چاہتا ہے:

۱۔ یہ اندازِ نگارش خواہ اپنی جگہ ادبیت کا شاہکار قرار پائے دینی جرائد خصوصاً 'بیّنات' اور اس کے بھی 'ادارتی صفحات' کے شایانِ شان نہیں ہے!

۲۔ سورۂ حجرات کی آیت ۱۱ میں انہی امور سے منع فرمایا گیا ہے ـــــ یعنی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○

اے ایمان والو! نہ مذاق اڑائیں تم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ بعض عورتیں دوسری عورتوں کا، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ ـــ اور نہ عیب چینی کرو ایک دوسرے کی، اور نہ بُرے نام رکھو ایک دوسرے کے۔ ایمان کے بعد بُرا نام بھی بہت بُرا ہے۔ اور جو لوگ باز نہ آئیں تو (اللہ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔

۳۔ زبان اور قلم راقم کے پاس بھی ہیں، اور خواہ یہ مولانا لدھیانوی کی زبان و قلم کے

مقابلے میں نہایت حقیر اور بے بضاعت ہوں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس سے نفس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے ــــــ پھر ماہانہ جرائد بھی راقم کے پاس ایک چھوڑ دو دو ہیں، اور خواہ ـ ڈائجسٹوں کے مقابلے میں ان کا حلقۂ اشاعت بہت محدود ہو، دینی جرائد کے اعتبار سے ہرگز کم نہیں ہے ــــ لیکن ایک خاص سبب سے راقم یہ صورت اختیار نہیں کرسکتا ــــ گویا بقول شاعر ؎

"ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی !"

۴ ـ اور وہ 'خاص سبب' یہ ہے کہ راقم کی حیثیت اس وقت 'سائل' کی ہے ـ اس نے جس دینی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ آیۂ مبارکہ " وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ " (العنکبوت : ۶) کے مطابق سراسر اپنے ہی 'بھلے' اور اپنے ہی 'فائدے' کے لئے اٹھایا ہے' اس میں جب وہ تعاون کا طلب گار ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ؎ " مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج !! " کے مصداق ایک طرح کا 'سوال' ہی ہے ـ

یہ بھی واضح رہے کہ راقم ابھی تو صرف حلقۂ دیوبند، خصوصاً متوسلین شیخ الہندؒ ہی کے در پر سوالی بن کر حاضر ہوا ہے کہ بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں اور جوان اس کا ساتھ دیں' ــــــ راقم کا ارادہ ہے کہ وقت آنے پر' اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واثق امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ آگے بڑھ کر دوسرے مسلکوں کے علماءِ کرام کی خدمت میں بھی سوالی بن کر حاضر ہو گا ــــــ اس لئے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے زمانے میں جمعیت علماء ہند، جملہ مسالک کے علماء کا مشترک پلیٹ فارم تھی اور جس طرح آنحضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر " نسیئی " کا رواج منسوخ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ " اِسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ " راقم کے نزدیک قدرتِ خداوندی سے یہ ہرگز بعید نہیں کہ برِ صغیر پاک و ہند میں بھی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کی فضا پھر لوٹ آئے ــــــ اس ضمن میں مولانا لدھیانوی ہی نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کا ایک سبق آموز واقعہ سنایا تھا کہ مولانا محمد علی جالندھریؒ جب بریلوی مکتبِ فکر کے علماء کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ کے ہاں گئے اور

انہوں نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں گفتگو تک سے انکار کر دیا تو مولانا جالندھریؒ نے اٹھتے اٹھتے یہ جملہ کہا: "حضرت ہم اپنے کسی کام کے لئے حاضر نہیں ہوئے تھے، آپ ہی کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ناموس کی حفاظت کے ضمن میں تعاون درکار تھا!" تو مولانا قادریؒ کا رنگ ایک دم تبدیل ہو گیا اور انہوں نے پوری توجہ سے بات سنی اور تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔

تو راقم بھی بحمد اللہ اپنی کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لئے کھڑا ہوا ہے اور اس کے ضمن میں وہ اگر سرپرستی اور تعاون کا سوال کر رہا ہے تو اس کی حیثیت بھی ایک 'سائل' کی ہے۔ لہٰذا مولانا الدھیانوی ایسے حضرات کو اگر ابھی کچھ شکوک و شبہات ہیں تو بیشک سوالی کو خالی ہاتھ لوٹا دیں لیکن کم از کم "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ" ——— "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ" اور "فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا" کی قرآنی ہدایات کو تو پیشِ نظر رکھیں!

اس گلہ اور شکوہ سے قطع نظر ——— مولانا الدھیانوی نے "قرآن حکیم کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات" پر تبصرہ کے ضمن میں راقم کی تشخیص کو "سطحی" قرار دیتے ہوئے جو اصل تشخیص خود کی ہے وہ مختصر الفاظ میں تو یہ ہے کہ:

"ان تحریکات کے قائد و بانی علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، جو کسی دینی تحریک کے قائد و بانی کے لئے ناگزیر ہے"۔

اور مزید شرح ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:

"پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور اربابِ باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی تصحیح نہ کی ہو۔ اس کے بارے میں کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے گا، اور وہ کسی افراط و تفریط خود رائی و کجروی کا شکار نہیں ہوگا ——— ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا جس نے کسی مردِ کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا، جس نے لائق اعتماد مشائخ سے

حکمتِ دین کا درس نہیں لیا، جس نے کتاب و سنّت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا، جس نے اپنے علم و عمل، عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوۂ نبوی میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی، اور جس کا فہمِ دین جنگل کی خودرَو گھاس ہے، وہ دینی قیادت کا منصب سنبھالتا ہے ...."

بنابریں ان کی 'تجویز' یہ ہے کہ:

"میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان سے عرض کیا جائے کہ آپ ایک نئی جماعت بنا کر اور بیعت کی نئی طرح ڈال کر امّت کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں۔ یہ امّت نئی نئی اصطلاحات اور دین کے نام پر وجود میں آنے والی نئی نئی تنظیموں کے چرکوں سے پہلے ہی چُور چُور ہے۔ خدارا اس پر رحم کیا جائے اس کو کسی نئی تنظیم نئی بیعت اور نئی اصطلاحات کی آزمائش سے معاف رکھا جائے۔"

گویا ان کا راقم کو مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ راقم اس پورے کام کی بساط لپیٹ کر رکھ دے جس کے لئے اس نے عمرِ عزیز کے پورے بیس سال تو اس کیفیت کے ساتھ کھپائے ہیں کہ ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا — تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریّتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس سے پہلے بھی کم و بیش پندرہ سال اسی کیفیت میں گذرے تھے کہ 'دعوت و تحریکِ اسلامی' ہی اس کی زندگی میں اہم ترین اور مقدم ترین شئے تھی!!

راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ اسے مولانا لدھیانوی کے خلوص و اخلاص پر ہرگز کوئی شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اسے مولانا تقی عثمانی صاحب کے متذکرۃ الصدر فتوٰی کے بھی مبنی بر اخلاص ہونے میں کوئی شک نہیں ——— اور راقم کے علم میں ہے کہ دوسرے بہت سے مخلص علماء کرام کو بھی راقم سے اسی بنا پر اندیشے اور خدشے لاحق ہیں (چنانچہ کراچی کے مولانا عبد البرّ سکھر گاہی صاحب بھی راقم کے پاس ان ہی دلائل پر مشتمل طویل خط کے ساتھ تشریف لائے تھے!) ——— یہی وجہ ہے کہ راقم اس مسئلہ پر کھل کر بات کرنی چاہتا ہے!

اس دلیل کا لبِّ لباب یہ ہے کہ خدمتِ دین کا بیڑا اٹھانے والوں کو دو شرطوں پر پورا اترنا چاہئے: ایک یہ کہ وہ باضابطہ اور مستند عالمِ دین ہوں، اور دوسرے یہ کہ متقی اور مزکّٰی ہوں! ——— ان میں سے دوسری چیز تو کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس

کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا، لہٰذا آخری تجزیے میں شرطِ واحد یہ رہ جاتی ہے کہ علم دین کا حصول مروّجہ معیارات کے مطابق کیا ہو ـــــ اور مسلّمہ المقام علماء سے سندِ فراغت حاصل کی ہو!

اس پر سب سے پہلی گذارش تو راقم کی یہ ہے کہ کسی ایک ہی ایسے بڑے فتنے کا نام بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والے مستند عالم دین اور مسلّم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہوں۔ چنانچہ کیا مسلم انڈیا کی تاریخ کے سب سے بڑے فتنے یعنی 'دینِ الٰہی' کے مصنف ابوالفضل اور فیضی مسلّم عالم دین نہ تھے؟ اسی طرح عہدِ حاضر کے عظیم فتنوں کے بانیوں میں سے کیا سرسید احمد خان مرحوم وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق عالم دین ـــــ اور بہترین علماء کے فیض یافتہ نہ تھے؟ کیا حکیم نورالدین بھیروی نے وقت کے چوٹی کے علماء سے کسب علم نہیں کیا تھا (اور واضح رہے کہ غلام احمد قادیانی کی گمراہی میں اصل دخل اسی شخص کو حاصل تھا!) کیا مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیراج پوری علماء میں سے نہ تھے؟ (غلام احمد پرویز کا ذکر چھوڑ دیجئے کہ وہ ان ہی اصحاب ثلثہ یعنی سرسید، علامہ جیراجپوری اور مولوی چکڑالوی کا خوشہ چین ہے، خود کچھ نہیں!) مزید قریب آکر دیکھئے! کیا مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے سندیافتہ فارغ التحصیل اور پھر علامہ فراہیؒ، ایسے محقق قرآن اور محدّث مبارکپوریؒ ایسے عالم و شارح حدیث نبویؐ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟ ـــــ اس سے بھی زیادہ قریب کی مثال درکار ہو تو کیا ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی باضابطہ سندیافتہ "فاضلِ علومِ دینیہ" اور خود حضرت مولانا بنوریؒ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ہدایت وضلالت کا دارومدار 'علم' پر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے۔ ایک انسان کی اپنی نیت وارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق وتیسیر!! ـــــ اگر انسان کے اپنے دل میں کجی اور نیّت میں فتور ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنّت کے مطابق کہ "فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ" اس سے توفیق خیر سلب فرمالے تو ایسا انسان جتنا بڑا عالم وفاضل ہوگا اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھائے گا ـــــ بلکہ بڑے فتنے تو بڑے علماء وفضلاء ہی اٹھا سکتے ہیں غریب عامی وامّی انسان فتنہ اٹھانا چاہے گا بھی تو کوئی بڑا فتنہ کیسے اٹھائے گا۔ یہی بات علماء کرام مولانا رومؒ کے اسی شعر کے حوالے سے بیان کیا کرتے ہیں کہ ؎

علم را بر دلِ زنی یارے بود علم را بر تنِ زنی مارے بود!!

اور یہی بات آنحضورؐ کے اس قول میں وارد ہوئی ہے کہ "ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمانوں کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی، آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے، فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے!" (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

اس ضمن میں ۵۲-۱۹۵۱ء کا ایک واقعہ یاد آیا۔ راقم اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن اور میڈیکل کا طالب علم تھا۔ برادرم خرم جاہ مراد نے جو اس وقت جماعت اسلامی کے صفِ دوم کے رہنماؤں میں بہت نمایاں ہیں راقم سے ایک 'آٹوگراف' کی فرمائش کی تو راقم نے یہ الفاظ لکھے:

"کبھی کبھی میرا دل ان لوگوں کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی تحریکِ اسلامی کی اوّلین صفوں میں تھے لیکن اب اسی نسبت سے دور جا چکے ہیں ——— میں خود 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کے بعد 'رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ' کا سہارا لیا کرتا ہوں ——— اور اسی کا مشورہ اپنے عزیز ترین دوستوں کو دیا کرتا ہوں۔"

یہ آج سے ثلث صدی قبل کی بات ہے ——— راقم کو یقین ہے کہ یہ انہی مبارک دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ راقم نے چوبیس برس کی عمر میں مولانا مودودی مرحوم ایسی عظیم شخصیت سے صرف اختلاف ہی نہیں کیا، ماچھی گوٹھ کے عظیم اجتماع میں ان کے رُو در رُو اپنی دانست کے مطابق 'احقاقِ حق' اور 'ابطالِ باطل' کی سعی کی۔ اور وہ کتاب تالیف کی جس پر خراجِ تحسین خود مولانا لدھیانوی نے ادا فرمایا تھا اور جس پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا تھا:

"میں نے آپ کی کتاب آتے ہی پڑھ ڈالی ——— میرے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن و فکر پر کوئی دوسرے اثرات نہیں تھے جس کا تمام دینی شعور جماعتِ اسلامی ہی کی گود میں پلا بڑھا اور تمام تربیت اسی کے سانچے میں ہوئی اس کا ذہن اس قابل ہوا کیسے کہ جماعت کی پالیسی سے اتنی جلدی بے اطمینانی محسوس کرنے لگے! میرے خیال میں شاید اس کی دوسری مثال جماعت میں موجود نہیں ہے......"

(طبع شدہ 'میثاق'، مشمولہ کتاب 'سرافگندیم'، صفحہ ۱۲۲)

پھر یقیناً یہ بھی ان ہی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ ابتداء میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے حد درجہ متأثر بلکہ مرعوب ہونے کے باوجود، اور ان کے ساتھ طویل ترین اور قریب ترین تعلقات کے باوصف راقم نے اوّلاً تصوّف کے ضمن میں ان کی رائے سے اختلاف کیا، اور ان کی برہمی کے باوجود عین اس دور میں جبکہ 'میثاق' ان کے "زیرِ سرپرستی" شائع ہوتا تھا تصوّف کی حمایت میں مضامین شائع کئے ـــــ اور بالآخر رجم کے مسئلے پر ان کے ساتھ آخری تعلق کا تسمہ بھی توڑ ڈالا۔ (اس 'وصل و فصل' کی پوری داستان راقم 'میثاق' دسمبر ۷۶ء میں شائع کر چکا ہے)

الغرض، مولانا لدھیانوی اور جملہ علمائے حقانی کے کرنے کا اصل کام، یہ ہے کہ خود انہیں اللہ تعالیٰ نے جو خیرِ کثیر عطا فرمایا ہے اس پر اس کا شکر بجالائیں اور راقم کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسے شیطان اور نفس کے فتنوں سے اپنی حفاظت میں رکھے ـــــ اور اگر اپنے وقت اور صلاحیت کا ایک حصّہ اس کام کے لئے بھی وقف کر دیں کہ مجھ پر، میری سرگرمیوں پر، اور میری تحریروں پر نظر رکھیں اور جہاں کجی نظر آئے تعیّن کے ساتھ متنبّہ فرما دیں تو اسے تو راقم ان کا اپنے اوپر ذاتی احسان سمجھے گا! (چنانچہ یہی فلسفہ ہے تنظیم اسلامی کے 'حلقۂ مستشارین' کا جس میں شمولیت کی دعوت راقم نے حضرت مولانا بنوریؒ کو دی تھی لیکن انہوں نے کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ مولانا اصلاحی سے راقم کے قرب کے باعث قبول نہ کی تھی!)

اس ضمن میں ایک واقعہ اور یاد آیا۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ مشفق مکرّم سردار اجمل خان لغاری (رحیم آباد، ضلع رحیم یار خاں) کی موجودگی میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی مدظلّہ نے راقم کے بارے میں کچھ تنقیدی کلمات ارشاد فرمائے جس پر لغاری صاحب نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ کی اس سے کبھی ملاقات ہوئی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی تقریر سنی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی کوئی تحریر پڑھی؟ ـــــ اور جب تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ملا تو انہوں نے باصرار عرض کیا کہ میرے ساتھ ابھی لاہور چلئے، میں اس سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں! جس پر حضرت مفتی صاحب نے حامی بھر لی ـــــ چنانچہ یہ حضرات لاہور تشریف لے آئے، اور گلبرگ میں لغاری صاحب کے بھانجے کے مکان پر مقیم ہوئے ـــــ لغاری صاحب نے فون پر راقم کو حکم دیا کہ فوراً آؤ چنانچہ راقم حاضر ہو گیا! ـــــ گفتگو کا آغاز ہوا تو قبلہ مفتی صاحب نے فرمایا: "ہم کسی ایسے شخص کو درسِ قرآن کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں

جس نے نہ باقاعدہ علم حاصل کیا نہ علمائے حقانی اور اہل اللہ کی صحبت اٹھائی ؟" ـــ اس پر راقم نے قدرے توقف کے بعد عرض کیا "حضرت ! اوّل تو یہ آپ کی اجازت پر منحصر نہیں ـــــ دوسرے فرض کیجئے میں آپ کے حکم کی تعمیل میں درس بند کر دوں تو غلام احمد پرویز تو نہیں کرے گا ! تو بتائیے کہ اس سے دین کا نفع ہوگا یا نقصان ؟" ـــــ الحمد للہ کہ راقم کی اس دلیل کو مفتی صاحب نے کھلے دل سے قبول فرما لیا اور صرف اس قدر اضافہ فرمایا کہ "لیکن یہ لازم ہے کہ علماء کے ساتھ ربط ضبط رکھا جائے !" جس پر میں نے عرض کیا کہ "میں نہ صرف یہ کہ اس کے لئے انتہائی دلی آمادگی اور رغبت کے ساتھ تیار ہوں بلکہ پہلے سے اس پر عمل پیرا ہوں "[1] امید ہے کہ مولانا لدھیانوی اور ان کی طرز پر سوچنے والے علماء کرام معاملہ زیر بحث کے اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور فرمائیں گے !

جہاں تک 'تقلید' یا 'عدم تقلید' یا 'نیم تقلید' کی بحث کا تعلق ہے اس پر اصل مقدمہ تو مولانا عبدالقیوم حقانی (اکوڑہ خٹک) اور مولانا محمد ازہر (مدیر 'الخیر' ملتان) نے قائم فرمایا تھا ـــ اور راقم اپنی امکانی حد تک اس کے ضمن میں اپنی وضاحت پیش کر چکا ہے ، راقم مولانا لدھیانوی کا ممنون اور شکر گذار ہے انہوں نے میری ابتدائی تحریر ـــــ اور بعد کی وضاحت دونوں کو پیش نظر رکھ کر میری وضاحت کو قبول فرماتے ہوئے یہ جملے تحریر فرمائے ہیں :

۱۔ "امید ہے کہ موصوف کی یہ توضیحات ان کے ناقدین کے لئے بڑی حد تک اطمینان اور تسلی کا موجب ہوں گی"[2] (بینات ' فروری ۸۵ء صفحہ ۷)

---

[1] چنانچہ راقم اپنے اسی طرز عمل کے لئے استشہاداً پیش کرتا ہے 'قرآن کانفرنسوں' اور محاضرات قرآنی میں علماء کرام کی شرکت اور شمولیت کو ـــ اور خود ان کی خدمت میں حاضری کو ـــ جس پر مولانا لدھیانوی نے یہ معارضہ کر دیا کہ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ تم 'مستند' ہو گئے ! اس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ ؎ "خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے !"

[2] یاد ہو گا کہ بالکل اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے تحریر فرمائے تھے کہ : "ڈاکٹر صاحب نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماء حق کو مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے" اور "اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے !"

۲۔ "ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ: 'جنسِ اجتہاد یا نفسِ اجتہاد کے بقاء و تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں بالکل نئی صورتِ معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں' ______!"

البتہ اس معاملے میں جس حزم و احتیاط کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں نہایت عمدہ باتیں مولانا نے ارشاد فرمائی ہیں جو اپنی جگہ سب صد فی صد درست ہیں لیکن راقم سے ہرگز متعلق نہیں اس لئے کہ وہ اپنے بارے میں اہلیتِ اجتہاد کا مدّعی ہی نہیں ہے!

اس ضمن میں مسالک اربعہ میں سے کسی کو 'اختیار' کرنے پر 'اجتہاد' کے لفظ کا اطلاق زیادتی ہے۔ اور مولانا لدھیانوی نے تو نہیں، البتہ مولانا محمد ازہر صاحب نے ستم بالائے ستم کا معاملہ اس طرح کیا ہے کہ اسی کو مبنیٰ اور مدار بنا کر ایک مکمل مضمون سپردِ قلم کر دیا ہے جو 'الخیر' کے فروری کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں اجتہاد کی جملہ شرائط کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے (ساتھ ہی راقم کو ایک ذاتی خط بھی تحریر فرمایا ہے جس کے لئے راقم ان کا ممنون ہے) ______ راقم کا سوال ان سے صرف یہ ہے کہ آیا ائمہ اربعہ بھی ان کے معیار اجتہاد پر پورے اترتے تھے یا نہیں؟ اور اگر پورے اترتے ہیں تو ان کے فیصلے گویا   د کی جملہ شرائط کی سے چھلنیوں میں سے چھن کر آئے ہیں اور انہوں نے اجتہاد کے تمام کڑے امتحانات پاس کر لئے ہیں ____ اب ان میں سے کسی کے اختیار کرنے کے لئے ازسرِنو ان تمام شرائط کا پورا کرنا اور ان تمام امتحانات میں سے گذرنا کس دلیل سے لازم ٹھہرتا ہے؟

ایک دوسری زیادتی اس بحث کے ضمن میں مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کو بالجزم 'اہلحدیث' قرار دے دیا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ راقم اگر سکّہ بند 'حنفی' نہیں تو معروف اور متداول معنوں میں 'اہلحدیث' بھی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سکّہ بند اہلحدیث راقم کو اہلحدیث تسلیم نہیں کرتے (ابھی حال ہی میں فاتحہ خلفِ امام ہی کے مسئلے میں راقم کے موقف پر نہایت جارحانہ تنقید اپنے ہفت روزہ پرچے کی کئی اشاعتوں میں مولانا عبدالقادر روپڑی صاحب نے کی ہے!) گویا راقم کا معاملہ وہی ہے کہ ؎

"زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا   اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں"

اس ضمن میں غالباً مولانا لدھیانوی کی توجہ 'میثاق' دسمبر ۸۴ء کے شمارے میں شائع شدہ مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ کے ان الفاظ پر نہیں ہوئی کہ:

"ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے (یعنی راقم کے الفاظ میں 'نیم مقلد' بن جائے) تو شاید اس کے لئے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا....."

مزارعت کے ضمن میں میری رائے پر جو اشکال مولانا لدھیانوی کو ہوا ہے وہ اسی پر تھوڑا سا مزید غور فرما لیتے تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ راقم سکہ بند اہلحدیث نہیں ہے! ـــــ اس مسئلے میں مزید زیادتی مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کی رائے کو مولانا طاسین مدظلہ کے مقالے سے تاثر کا نتیجہ قرار دیا ہے ـــــ حالانکہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ راقم مولانا کے مقالے کا حد درجہ مداح ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے 'حکمت قرآن' کی پندرہ اشاعتوں میں قسط وار شائع کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ راقم کی رائے اس سے بہت پہلے کی ہے ـــــ اور مولانا کے مقالے سے اسے صرف مزید تقویت حاصل ہوئی ہے ـــــ پھر نمعلوم کیوں مولانا لدھیانوی نے اس کے ضمن میں صرف فقہ حنفی کے "مفتی بہ" قول کا ذکر کیا اور امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے اپنی رائے کے لئے باضابطہ ان کا حوالہ دیا تھا! ـــــ یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ مزارعت کے باب میں میری سب سے زیادہ زور و شور کے ساتھ مخالفت اہلحدیث حضرات ہی کی جانب سے ہوئی۔ چنانچہ حافظ احسان الٰہی ظہیر صاحب نے اس پر میرے خلاف ایک غیظ و غضب سے مملو تقریر اجتماع جمعہ میں کی۔ اسی طرح مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ اور ان کے صاحبزادے برادرم صہیب حسن سلمہ نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا لیکن میں نے ان سب حضرات کو مولانا طاسین صاحب کے مکمل مقالے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پیش کر کے عرض کیا کہ اس پر علمی تنقید فرمائیے میں شائع کروں گا جس کا آج تک کسی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا!!

مولانا لدھیانوی کو ایک اور بہت بڑا مغالطہ یہ لاحق ہوا ہے کہ شاید میرے "جہاد بالقرآن" کا ہدف صرف 'فرقہ واریت' ہے ـــــ اور مغالطہ در مغالطہ یہ کہ فرقہ واریت سے میری مراد مسالک فقہیہ ہیں! راقم پہلی بات کے ضمن میں وضاحت اور دوسری سے کامل اعلان برأت کرتا ہے۔ راقم کے نزدیک مسلمانوں میں حقیقی فرقے تو دو

ہی ہیں : ایک سُنّی اور دوسرے شیعہ، اور ان کے مابین اختلاف صرف فقہ کا نہیں بلکہ بنیادی عقائد اور اصولوں کا ہے۔ دوسری جانب صورت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں (اور اسی طرح ہندوستان میں) اصل محاذ آرائی اور 'فرقہ واریت' دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین ہے جو ایک ہی فقہ کی پیروی کرتے ہیں! راقم مولانا لدھیانوی سے اس بات پر شدید احتجاج کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اسے اتنا کودن سمجھا کہ یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ " اس 'فرقہ واریت' سے ان کی مراد ائمۂ مجتہدین کا فقہی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے مذاہب یا مسالک ہیں!" مولانا اگر ذرا غور فرمائیں تو اس ضمن میں میری تقریر یا جو اقتباس انہوں نے 'بیّنات' بابت فروری ۸۵ء کے صفحہ ۳ پر دیا ہے اسی میں اس کی کامل تردید موجود ہے!

رہا جہاد بالقرآن کے 'اہداف' کا معاملہ تو مولانا نے راقم کی جس تقریر پر اظہار رائے کے لئے دو اقساط پر مشتمل مفصّل تحریر سپردِ قلم کی ہے اسی میں راقم نے پانچ 'محاذ' گنوائے ہیں : (۱) جاہلیتِ قدیمہ ـــــ جس میں مشرکانہ اوہام، بدعات، اور شفاعتِ باطلہ کے تصورات شامل ہیں (۲) جاہلیتِ جدیدہ یعنی الحاد اور مادہ پرستی ـــــ اور فحاشی و اباحیت (۳) بے یقینی اور تذبذب (۴) فرقہ واریت اور (۵) نفس پرستی اور شیطان کی وسوسہ اندازی ـــــ راقم کے نزدیک ان پانچوں محاذوں پر جہاد قرآن کی سیفِ قاطع سے ہوگا، بقول علّامہ اقبال مرحوم

؎ خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی ‌ ‌ ‌ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی!

لیکن چونکہ قرآن کے نام پر اٹھنے والے بہت سے گروہ " ضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا " کا مصداق بن گئے لہٰذا راقم نے پانچ احتیاطوں کا ذکر بھی کیا یعنی :

(۱) اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا رشتہ کسی صورت ٹوٹنے نہ پائے

(۲) تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین معتدل راہ اختیار کی جائے (یہ ہے وہ مسئلہ جس پر 'الخیر' میں بحث چھڑی تھی اور راقم نے وہ وضاحتیں کی تھیں جنہیں مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا لدھیانوی نے تو تسلی بخش قرار دیا ہے، لیکن مولانا محمد ازہر مطمئن نہیں ہوئے۔)

(۳) تمسک بالقرآن کے ضمن میں : (۱) آیاتِ احکام کی وہی تعبیر صحیح قرار دی جائے جو سنّتِ رسول، سنّتِ خلفاءِ راشدین رض، اجماعِ صحابہ رض اور سلف صالحین خصوصاً ائمۂ اربعہ

کے اجتہادات کے دائرے کے اندر اندر ہو ــــ (اا) البتہ تاریخی اور سائنسی مباحث میں جدید اکتشافات کو مدِّنظر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے!

(۴) علماءِ حقانی کے ساتھ ربط و ضبط ــــ اور ان کی خدمت میں طالب علمانہ حاضری اور

(۵) علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے کی پوری کوشش!!

مولانا لدھیانوی اگر تنقید کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان جملہ نکات کو پیشِ نظر رکھ کر تنقید فرمائیں۔ راقم اور اس کے ساتھی ان شاء اللہ العزیز حتی الامکان استفادہ کریں گے۔

آخر میں ایک غیر اہم سی بات جسے مولانا لدھیانوی کی تعبیر نے بہت اہم بنا دیا ہے ــــ اور وہ یہ کہ راقم کا اپنے آپ کو اور اپنے بعض رفقاء کو "اُمّی نبی کا اُمّی اُمّتی" لکھنا نہ کسی مبالغہ آمیز انکسار پر مبنی تھا نہ کسی ارادی 'مدحِ خود' پر ــــ بلکہ صرف اس اعتراف کے طور پر تھا کہ راقم باضابطہ فارغ التحصیل عالمِ دین نہیں ہے۔ اور راقم اس اعتراف کو "عصمتِ بی بی است از بے چادری" کے مصداق اپنے حق میں حفاظت کا ایک ذریعہ اور گویا ایک "ڈھال" سمجھتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو 'میثاق' ستمبر ۸۴ء صفحہ ۵۸) ــــ لیکن اس کے بارے میں مولانا لدھیانوی کا یہ خیال ہے کہ اس میں "آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حق میں سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہے" ــــ تو اگرچہ راقم مولانا کی اس رائے سے متفق نہیں ہے تاہم اس کے امکان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے راقم عہد کرتا ہے کہ آئندہ یہ الفاظ کبھی استعمال نہ کرے گا ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اعوذبک مِن الشّکّ والشرک۔ واعوذبک من النفاق والریاء۔ واعوذبک من ھمزات الشیاطین واعوذبک ربّ اَن یحضرون۔ واعوذبک من شر نفسی ومن سیأت اعمالی۔ واعوذبک من خزی الدنیا وعذاب الآخرۃ ــــ اَللّٰھُمَّ اھدنی و رفقائِی کُلّھم فی جمعیۃ خدّام القراٰن والتنظیم الاسلامی اَللّٰھُمَّ اغفرلنا وارحمنا ووفّقنا لما تحبّ وترضی۔ اَللّٰھم وفقنا ان نجاھد فی سبیلک باموالنا وانفسنا۔ اَللّٰھُمَّ ارزقنا شھادۃً فی سبیلک۔ امین ــــ یاارحم الرّاحمین!!

تذکرہ وتبصرہ (۲)

اسرار احمد

قادیانی مسئلہ

اور اس کا نیا اور پیچیدہ تر مرحلہ!

کچھ عرصہ سے مسلسل اطلاعات مل رہی تھیں کہ قادیانیوں نے فرضی ناموں سے نہایت درد بھری مظلومانہ فریاد پر مشتمل خطوط کی مہم پورے زور شور سے جاری کی ہوئی ہے جس کے ذریعے سادہ دل اور معاملے کی اصل نوعیت سے بے خبر مسلمانوں کے جذباتِ ایمانی اور جذبۂ رحم سے اپیل کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ دیکھئے! کیسا ظلم ہے کہ ہمیں کلمہ پڑھنے سے روکا جارہا ہے اور ہماری 'مسجدوں' سے کلمۂ طیبہ اور آیاتِ قرآنیہ کو جبراً مٹایا جارہا ہے —— اس ضمن میں چند بار مجھ سے اجتماعاتِ جمعہ میں بھی استفسار کیا گیا جس پر میں نے معاملے کی اصل نوعیت کی مختصر وضاحت کر دی —— لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کی مصنوعی اور جذباتی اپیل سے حنیف رامے صاحب ایسے دانشور سیاستدان اور جناب اعتزاز احسن ایسے منجھے ہوئے قانون دان بھی متاثر ہو جائیں گے —— میں خود پچھلے دنوں مسلسل سفر میں رہا جس کی وجہ سے اخبارات کے ساتھ رابطہ نہ رہا، واپسی پر جناب حنیف رامے کا مکمل بیان اور اس کا مولانا اللہ وسایا صاحب کی جانب سے مفصل جواب نظر سے گذرا تو اندازہ ہوا کہ 'قادیانی مسئلہ'، جو ہمارے جسدِ ملی میں ناسور کی حیثیت رکھتا ہے ایک نئے اور پیچیدہ تر مرحلے میں داخل ہو رہا ہے!

اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جس نے اس مسئلے کی پیچیدگی میں ایک نہایت خطرناک پہلو (DIMENSION) کا اضافہ کر دیا ہے —— اور وہ یہ کہ مولانا محمد اسلم کی گمشدگی اور پھر حادثۂ ساہیوال سے قادیانیوں کے جن جارحانہ عزائم کا ظہور شروع ہوا تھا - انہوں نے کلمۂ طیبہ کے بیج سینوں پر سجا کر باہر نکلنے اور گرفتاریاں دینے کی صورت میں ایک مستقل 'مظاہرے' کی شکل اختیار کر لی ہے —— تاحال تو غنیمت ہے کہ معاملہ قادیانی نوجوانوں اور ملک کی انتظامی مشینری کے مابین ہے، لیکن اگر خدانخواستہ معاملہ آگے بڑھا اور قادیانی جارحیت کے جواب میں عوامی ردِ عمل شروع ہو گیا تو صورت بہت خوفناک ہو جائے گی!

جہاں تک حنیف رامے اور انکی طرز پر سوچنے والے حضرات کا معاملہ ہے میں اُن سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ براہِ کرم اس سوال پر غور فرمائیں کہ وہ کیا سبب تھا جس کے باعث محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم وفداہُ اٰباءُنا وامّہاتنا ایسی شفیق و ودُود اور رؤوف ورحیم ہستی نے ایک نام نہاد 'مسجد' یعنی منافقین کی تعمیر کردہ 'مسجدِ ضرار' کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا تھا؟ —— اسی طرح وہ کیا سبب تھا

جس کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کی سی وضع قطع اختیار کرنے سے روک دیا تھا؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا صرف ایک جواب ممکن ہے اور وہ یہ کہ چونکہ اسلام عُرفِ عام کے مطابق صرف ایک 'مذہب' نہیں ہے بلکہ 'دین' یعنی مکمل نظام زندگی ہے ـــ لہٰذا اُس کا دائرہ کار صرف بندے اور ربّ کے مابین ایک نجی تعلق کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اوّلاً ایک معاشرے اور قومیت کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنی حکومت اور ریاست قائم کرنی چاہتا ہے ـــ بنابریں اس کے نظام میں انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتوں کے مابین ایک حسین توازن موجود ہے اور بعض معاملات میں قومیت اور ریاست کے تحفظ کے لئے ایسے اقدامات لازمی ہوتے ہیں جو بظاہر انفرادی آزادی پر قدغن نظر آتے ہیں ـــ چنانچہ ان ہی کے ذیل میں آتے ہیں آنحضورؐ اور حضرت عمرؓ کے متذکرہ بالا اقدامات بھی ـــ اور اسی کے ذیل میں آتا ہے موجودہ حکومت کا یہ فیصلہ بھی کہ قادیانی کوئی ایسی نشانی یا علامت، تقریری یا مرئی نقوش کے ذریعے استعمال میں نہیں لا سکتے جس سے عوام کو ان کے مسلمان ہونے کا دھوکا لگے!ـ اور یہ لازمی منطقی نتیجہ ہے آنجہانی غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوّت کا جس کی بنا پر اُن کے ماننے والے لوگوں کے نزدیک وہ سب لوگ کافر قرار پائے جنہوں نے اُن کو نہیں مانا اور پوری اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک ان لوگوں کے کفر اور ارتداد میں ہرگز کوئی شک و شبہ نہیں ہے جنہوں نے کسی بھی حیثیت سے انہیں مان لیا ـــ اب جناب غلام احمد قادیانی اور اُن کی ذریّتِ صلبی و معنوی کی 'پختہ زنّاری'' کا عالم تو یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے حق میں لچر سے لچر زبان اور گھٹیا سے گھٹیا مذہبی گالیاں استعمال کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے ـــ حتیٰ کہ اس نئی اُمّت' کا ایک مشہور و معروف فرد اپنے محسن و مربّی اور بانی ریاست و سربراہ مملکت قائد اعظم محمد علی جناح تک کی نماز جنازہ پڑھنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیتا ہے کہ ''مجھے خواہ ایک مسلمان ملک کا غیر مسلم وزیر قرار دیدیا جائے خواہ ایک غیر مسلم حکومت کا مسلمان وزیر!'' ـــ لیکن ہمارے دانشوروں اور سیاستدانوں کی ''رقّتِ قلب'' اور ''وسعتِ قلبی'' کا عالم یہ ہے کہ قادیانیوں کو 'غیر مسلم اقلیت' قرار دے کر اُن کے جان و مال اور عزّت و آبرو کو پورا تحفظ دینے ـــ اور انہیں عقیدہ و عبادات کے ضمن میں پوری آزادی دینے کے بعد ـــ صرف اُنکی جارحانہ پیشقدمی کی روک تھام کے لئے کچھ ناگزیر اقدامات کئے جاتے ہیں تو اُن کا 'جذبۂ رحم' اور 'داعیۂ حمایتِ مظلوم' جوش میں آجاتا ہے ؎

"وہ دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیح شیخ !!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زنّاری بھی دیکھ !"

جناب رائے اور اُن کے ہم خیال حضرات کے لئے طے کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو

غیر مسلم سمجھتے ہیں یا مسلمان ؟ ـــــ اگر خدانخواستہ بات دوسری ہے تو انہیں ہیر پھیر کا راستہ چھوڑ کر ـــــ اور خواہ مخواہ کی جذباتی دلیلوں اور اپیلوں کا سہارا لینے کی بجائے خم ٹھونک کر میدان میں آنا چاہیئے اور اپنا مؤقف صاف صاف بیان کرنا چاہیئے ـــــ اور اگر بات پہلی ہے اور اُن کا دل اس پر ٹھکتا ہے کہ قادیانی غیر مسلم ہیں تو پھر انہیں اپنے سینے پر پتھر رکھ کر اس کے منطقی نتیجے کو کھلے دل سے قبول کر لینا چاہیئے کہ قادیانیوں کو "شبہ بالمسلمین" سے روکا جائے تاکہ وہ سادہ لوح اور ناواقف مسلمانوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر مرتد نہ کر سکیں ۔

اس موقع پر میں قادیانی حضرات کی خدمت میں بھی یہ گذارش ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حق میں ۱۹۷۴ء کا فیصلہ نرم ترین اور مناسب ترین ہے جسے آپ لوگوں کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے ۔ اس لئے کہ اُس کے ذریعے آپ لوگوں کو ایک مُسلّم اقلیت (RECOGNISED MINORITY) کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ جس سے آپ کو وہ جملہ مذہبی، سماجی اور اقتصادی حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو دوسری تمام اقلیتوں کو حاصل ہیں ۔ اب خود آپ کی اپنی مصلحت کے اعتبار سے آپ کے لئے بہترین لائحہ عمل یہ ہے کہ مسلمان ممالک (بشمول پاکستان) کی حد تک اس مرتبۂ اقلیت (MINORITY STATUS) پر قناعت کریں اور اپنی دعوت و تبلیغ کے جملہ حوصلے اور ارمان غیر مسلم ممالک میں نکال لیں ـــــ پاکستان میں اگرچہ تا حال دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی تبلیغی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں ہے تاہم اس وقت عالمی سطح پر احیائے اسلام کی جو تحریک برسرِ کار ہے اس کے پیشِ نظر وہ دن زیادہ دُور نہیں ہے جب مسلمان ممالک میں پورا پورا شرعی نظام قائم ہوگا اور اس کے نتیجے میں غیر مسلموں کی تبلیغی سرگرمیوں پر مکمل پابندی بھی عائد ہو کر رہے گی اور ارتداد کی سزا بھی نافذ ہو کر رہے گی جس کی مثالیں ایران اور سوڈان میں سامنے آ بھی چکی ہیں !) ـــــ پھر آپ لوگوں کے معاملے ایک اضافی پیچیدگی یہ ہے کہ کوئی عیسائی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتا اور جب وہ تبلیغ کرتا ہے تو مسلمانوں کو صاف صاف اسلام ترک کر کے عیسائیت اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے جبکہ آپ اپنے آپکو مسلمان سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو بزعم خویش "کفر" سے تائب ہو کر اپنے خود ساختہ "اسلام" میں داخلے کی دعوت دیتے ہیں ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں کوئی گرجا مسمار کیا گیا نہ صلیب توڑی گئی، حتیٰ کہ یہودیوں کی عبادت گاہ بھی کراچی میں شان و شوکت سے کھڑی ہے لیکن آپ کی عبادت گاہوں کے خلاف اقدام ہو رہا ہے ـــــ !! بنابریں مصلحت اسی میں ہے کہ آپ اپنی عبادت گاہوں کے لئے تعمیر کا ڈیزائن بھی کوئی نیا اختیار کر لیں اور اُن کے لئے نام بھی نیا تجویز کر لیں (جیسے مثلاً آپ کی علامہ اقبال روڈ لاہور پر واقع عبادت گاہ کا نام

"دارالذکر" ہے!) اور ان کے باہر کلمۂ طیبہ اور آیاتِ قرآنیہ لکھنے سے بھی احتراز کریں —— اس کے بعد آپ آزاد ہیں، اندر آپ جو چاہیں لکھیں، جو چاہیں پڑھیں اور جس طرح چاہیں عبادت کریں۔ —— بصورتِ دیگر اگر آپ لوگوں نے اپنی جارحانہ 'دعوت و تبلیغ' کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اس میں 'قوت کے مظاہرے' کا عنصر مزید شامل کر لیا تو یاد رکھئے کہ جس طرح ۱۹۷۴ء کی ربوہ ریلوے اسٹیشن کی 'جارحیت' آپ لوگوں کو بہت مہنگی پڑی تھی اسی طرح اب پاکستان کے مسلمان حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہونگے کہ 'قتلِ مرتد' کی کتاب و سنت سے ثابت اور اجماعِ اُمت پر مبنی سزا کو فی الفور نافذ کیا جائے —— تاکہ فتنۂ ارتداد کے آگے مؤثر بند باندھا جا سکے!

اس سلسلے میں اگر قادیانی حضرات کا خیال یہ ہو کہ اُن کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے اور پھر اُن کے لئے 'اسلامی علامات' اختیار کرنے پر پابندی لگنے کے فیصلے کسی نے وقتی مصلحت کی خاطر کرا دیئے ہیں اور کسی آئندہ حکومت کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ انہیں تبدیل کرا سکے تو وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں —— اس لئے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخ ساز فیصلہ تو ایک ایسی حکومت کے دَور میں ہوا تھا جس سے زیادہ سیکولر مزاج حکومت کا پاکستان کے لئے تصور تک نہیں کیا جا سکتا —— اور اب جو اسی فیصلے کے مطابق اگلا منطقی قدم اٹھایا گیا ہے تو یہ بھی کسی فردِ واحد کے مذہبی مزاج کا نتیجہ نہیں ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ اقدام بہت پہلے ہو جاتا —— بلکہ یہ دونوں اقدام ملکی سطح پر مسلسل عوامی دباؤ اور پورے عالمِ اسلام میں حالات کے 'احیاءِ اسلام' کے رُخ پر پیشقدمی کا نتیجہ ہیں —— جو اگرچہ نہایت سُست رفتار بھی ہے، اور ہماری کوتاہیوں اور نااہلیوں کے باعث وقتی اور فوری ردِ عمل اور اس کے نتیجے میں عارضی پسپائی کا شکار بھی —— بایں ہمہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اب وہ دِن بہت زیادہ دور نہیں ہیں جب خالص اور ٹھیٹھ دینِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کو عالمی غلبہ حاصل ہوگا اور کوئی 'مثیلِ مسیح' نہیں بلکہ اصل اور حقیقی مسیح عیسٰی ابن مریم علیٰ نبیّنا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور ایک جانب موجود نام نہاد عیسائیت کو ختم کر دیں گے —— اور دوسری جانب یہودیوں اور ان کے معاونین کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے! —— لہٰذا قادیانیوں کیلئے صحیح راہِ ہدایت تو یہ ہے کہ وہ جھوٹے مدّعیِ نبوت سے کامل انقطاع اور اظہارِ براءت کر کے "جا ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!" کے مصداق دوبارہ اصل اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں شامل ہو جائیں، —— بصورتِ دیگر کم از کم 'عافیت' کی راہ یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں غیر مسلم اقلیت کی حیثیت کو دل سے قبول کر کے اپنی دعوت و تبلیغ کا رُخ غیر مسلم ممالک کی جانب موڑ دیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را!

۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوّت

اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر تبصرہ

از ڈاکٹر اسرار احمد

(ماخوذ از میثاق، نومبر ۷۴ء)

اگرچہ جس وقت 'میثاق' کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، اس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا فیصلہ خاصہ پرانا ہو چکا ہو گا۔ تاہم جی نہیں مانتا کہ 'میثاق' کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر اس قسم کی جناب میں ہدیۂ تشکّر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملّتِ اسلامیہ پر ہوا ہے ـــــ اس لئے کہ اگرچہ عالم اسباب میں اس تاریخی فیصلہ کے بہت سے عوامل ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا جس نے جملہ اسباب و عوامل کو جمع و کر کے اس طرح ایک ہی رُخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لئے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

لہٰذا ـــــ اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کے مطابق کہ "مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ"[1] پوری ملّتِ اسلامی کی جانب سے مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیّت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمّل اور نظم و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور علماء کرام اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظّم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا اور اس سلسلے میں سخت محنت اور مشقت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لئے۔ یہاں تک کہ

---

[1] "جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔" (الحدیث)

قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند اور تنومند نوجوانوں کے لئے بھی مشکل ہو، پھر مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں ممبران اسمبلی اور ارکان پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی اور حکومتِ وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا، نہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا۔ خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبر اور فہم و فراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے ——— لیکن ہمارے شکر و سپاس کا اصل حقدار اور ہمارے تشکر و امتنان کا سزاوارِ حقیقی ہے اللہ رب العلمین جو " فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ " بھی ہے اور " غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ " بھی اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں تمام اسباب و علل اور جملہ وسائل و عوامل ، فَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

جیساکہ قارئین ' میثاق ' کو معلوم ہے ، راقم الحروف ۲۸ / مئی سے ۲۰ / جون تک تقریباً مسلسل لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کچھ بحالئ صحت اور کچھ بعض معاملات و مسائل پر گوشہ تنہائی میں غور و فکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادئ کاغان کا ہوا، پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا، اسی دوران میں جب ' حادثہ ربوہ ' کی خبر پڑھی تو فوراً جو خیال دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ غالباً تقدیر الٰہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسّی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا ، گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق " THIS IS THE BEGINNING OF THEIR END! " تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار اور کائیاں و شاطر گروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں بھی راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا اور جب ۱۴ / جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماع جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی راقم نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص خدائی تدبیر ہے اور اس بار یہ مسئلہ انشاء اللہ العزیز ضرور تسلی بخش طریقے پر طے ہو جائے گا اور پھر جب تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ / جولائی کو جامع مسجد خضراء سمن آباد میں پہلا جمعہ پڑھایا تو اس موقع پر بھی ایک مفصل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر جو اتفاقاً ٹیپ کر لی گئی تھی ، رفقاء و احباب نے اپنے حسن نظر کے باعث بہت پسند کی ، اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے سخت محنت جھیل کر اسے صفحۂ قرطاس پر بھی منتقل کر لیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے ' میثاق ' میں شائع کر دیا جائے لیکن اس وقت سفر کی پابندی کے باعث ان کی

یہ خواہش پوری نہ کی جا سکی۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصّہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک تو ان کی خواہش پوری ہو جائے اور ان کی محنت سپھل ہو اور دوسرے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے یہ خیالات وقوعہ کے پیش آ چکنے کے بعد کی خیال آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصّہ جو "عقیدۂ ختمِ نبوّت اور قرآن حکیم" کے موضوع پر اظہارِ خیال پر مشتمل ہے انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!) :-

" حمد و ثنا اور تلاوتِ آیات کے بعد عرض کیا گیا :-

حضرات ! ۲۸ مئی کے بعد آج ۵ جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ادھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور ادھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا۔ یعنی حادثۂ ربوہ — اور اس کے بعد پوری شدّت کے ساتھ اس مسئلے نے سر اٹھا لیا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدّت کے ساتھ احساس آج سے تقریباً اکیس سال قبل ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ لیکن ۵۳ء کے حوادث کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا اور بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کاشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجّہ دلاتے رہتے تھے یا بعض غیر اہم قسم کے ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے، کوئی عوامی تحریک اس مسئلے کے بارے میں موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے اس حادثہ نے اس کو ازسرِنو زندہ کر دیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی، اس کی سازشی فطرت اور اس کی مکّاری کا ملک گیر احساس اجاگر ہوا اور ایوانِ حکومت سے لے کر خواص و عوام سب کی توجّہ ادھر مبذول ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا بلکہ میں نے جہاں تک حالات کا تجزیہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا!

یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور خاموشی لیکن انتہائی مہارت اور مشّاقی کے ساتھ جسدِ ملّت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے اور عام طور پر اس کی ہلاکت انگیزی کا لوگوں کو اندازہ نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے یا اس کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی

ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تتمہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے ابھرنے اور اٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! اور حقیقت یہ ہے کہ اس بار اس کے کریڈٹ کا کوئی شخص اور کوئی سیاسی پارٹی دعویٰ نہیں کرسکتی۔ بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے اور اس کا کریڈٹ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سٹیشن پر جو اقدام ہوا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے، بنیادی طریق کار اور اپنے سابق طرز عمل سے بالکل مختلف ہے ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسی، مدح سرائی اور اس کی ثنا خوانی کرکے اس سے مراعات حاصل کرو اور ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ اُمّت مسلمہ سے براہ راست تصادم سے ہمیشہ کنی کترانا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے، یہی ان کا طریق کار ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لئے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی حلک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہتے ہیں تو پھر بھی ان کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی، اس کی خوشامد، اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر اس کو بقا و ترقی کی دعائیں دے کر، اس کے مقاصد و مفادات میں مدّ و معاون ہو کر، اس کے زیر سایہ اور زیر عاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کرکے جسدِ ملت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسر اقتدار ہو خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی

حماقت کر کے حکومتِ وقت کو اپنے مدِ مقابل لا کھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور حکومت اور عوام بلکہ حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہٰذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ حکومت اور عوام سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آئے بغیر، امید ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ انشاء اللہ اس مسئلہ کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو امت کے لئے قابل قبول ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورت حال رونما نہیں ہوئی کہ اس مسئلے کے حل کی طرف کوئی ادنیٰ سا اقدام بھی ہوا ہو لیکن اس مرتبہ تائید ایزدی سے ایسے حالات خود بخود پیدا ہو گئے ہیں کہ انشاء اللہ العزیز اس بار یہ مسئلہ کھٹائی میں نہیں پڑ سکے گا۔ اس لئے کہ بحمد اللہ اس حد تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف ایک اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے TERMS OF REFERENCE کافی وسیع کر دیئے گئے ہیں، تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو اس گروہ کا گھناؤنا کردار اس تحقیقی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے اعلیٰ ترین بااختیار ادارے یعنی ملک کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور و فکر شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لئے نہایت مناسب ہیں اس وقت اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجئے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں؟ ان سب سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے قانونی اور دستوری طور پر جو صحیح اقدامات کئے جا سکتے ہیں وہ کر لئے گئے ہیں اور یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ انشاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی سخت ضرورت ہے :

ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیئے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ، ایجی ٹیشن اور دنگا فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے اس لئے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہو گا۔ بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور

مارشل لا لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا اور ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ اب تک جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کو ایک ہنگامہ خیز اور دھماکہ خیز صورت بنا دیا جائے اور حالات کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں Law & Order کا گھمبیر مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تاکہ حکومت اور عوام میں خوفناک تصادم ہو جائے۔ نتیجۃً موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر Law & Order قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے لہٰذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے اور عوام اور حکومت میں کسی طرح شدید تصادم کرا دیا جائے۔ آپ نے بھی سُنا ہوگا کہ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ "خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے" گویا انہوں نے اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیل ہو جائے اور فوج حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تاکہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور طریقوں سے فوج کو متاثر کر کے فائدہ اٹھا سکیں لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے Law & Order کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس موقع پر قادیانیوں کی اشتعال انگیزی کے جواب میں ہماری جانب سے بھی اسی قسم کا معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہوگی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیئے کہ اس مسئلہ کے اٹھانے اور اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ کسی سیاسی پارٹی کی جانب سے اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی

ہے لہٰذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیئے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیئے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت VERSUS حزب اختلاف کا مسئلہ بنا دیا جس کے نتیجہ میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لاینحل بن گیا۔ اس موقع پر یہ صورت حال پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت امید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو سونپی گئی ہے جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں اور چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں بہر حال وہ عملی سیاست کے میدان سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیئے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں، مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ خود قادیانیوں کی حماقت سے اٹھا ہے، پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس مسئلہ کے اٹھانے میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھا لیں۔ اگر ہم نے کفران نعمت کیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لئے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیئے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُرامن ذرائع

سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیئے یا دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیئے۔ اس کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین نزاعی مسئلہ بنانے سے پہلوتہی کرنی چاہیئے اور اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے ہر سیاسی پارٹی بالخصوص اپوزیشن کو بچنا چاہیئے۔ ہم کو یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعتاً ضرورت ہے۔ یہ صورت حال بڑی اطمینان بخش ہے لہذا انہیں موقع دینا چاہیئے کہ ایوان نمائندگان پُرامن فضا میں اس مسئلہ کو اس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری اُمّت مسلمہ کے لئے قابل قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ نرم کوئی اور مطالبہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی کمیونٹی (COMMUNITY) کو باقاعدہ اقلیت (MINORITY) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیئے جائیں! یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا اقرار (RECOGNITION) اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت (MINORITY COMMUNITY) کی حیثیت سے تسلیم کرلے تو گویا یونائیٹڈ نیشنز کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہو گئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ طے کرنے ہوں گے اور ان کو اپنی کتاب دستور میں مندرج کرنا ہوگا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینا ہوگی اور آپ کے ملک کی عدالت عالیہ ان حقوق کی نگہداشت کرے گی۔ قادیانیوں کے لئے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت کا عقیدہ اُمّت مسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا دراڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتل مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے اُمّت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی "برکات" ہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم کہ:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ — گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر — اناالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اُسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوتے ۔ یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشار فکر و نظر اس کو عین مطلوب تھا لہٰذا وہ کیوں ان کا نوٹس لیتا۔ اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں، جھاڑ جھنکار نشوونما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافت راشدہ کا دور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت ہوتی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کا مقام دار و رسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو متحارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور مختلف اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعین افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ آپ کو گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی متعین شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہو گیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ آپ کو بتاتے گی کہ کتنی معمولی، چھوٹی اور بالکل فروعی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے لیکن قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرف نظر کیا گیا تو ملت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔ دعویٰ نبوت درحقیقت وہ رخنہ اور فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اٹھتے رہے اور امت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ اگر اس کو ایک ہی بار کھول

دیا گیا تو منطقی طور پر اُمّت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعویٰ نبوّت کرے تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مومن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے وہ کفر و ایمان کا معیار بن کر آتا ہے جو اس کو نہ مانے چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو مانتا ہو اور خالص توحید کے ساتھ مانتا ہو وہ آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفاصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو، تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو، ملائکہ کو مانتا ہو، زاہد ہو، عابد ہو، بڑا ہی متقی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا، اس پر کفر کا ٹھپّہ لگ جائے گا اور وہ مومن نہیں بلکہ کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوّت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجئے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز باعثِ اختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لئے پھرتے ہیں، اس میں انجیل (NEW TESTAMENT) کے ساتھ ساتھ عہد نامہ عتیق OLD TESTAMENT کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں گویا عیسائی تورات، زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لئے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کی نبوّت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے اس کو مانا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا امتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجئے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے؟ یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیحؑ کے متبع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں لیکن یہ متبعین حضرت مسیحؑ، ہمارے نبی سید المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے لہٰذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر، گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچایا ہے جب وہ ایک نئی نبوّت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوّت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک

اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نئی نبوت کا کھڑاک مول لیا گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرمانبرداری میں دے دیا اور خود کو بالکلیہ SURRENDER کر دیا۔ اور اب اس نبی کے مقابلے میں اُس کا فکر، اُس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے کوئی شخص جب ظلی طور پر، بُروزی طور پر یا کسی اور اعتبار سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوالے تو اب وہ ماننے والے کے لئے امام معصوم بھی ہو گیا، واجب الاطاعت بھی ہو گیا، اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر ہو جائے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے، امیر سے، سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، آپ ان کے خلاف سوءِ ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں چونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس برصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی "نبوت" کا تصور ہے۔ یہ فائدہ نبوت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ، نمازیں علیحدہ یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے۔[1] حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے مرزا بشیر الدین محمود سے پوچھا گیا کہ بچے تو معصوم ہوتے ہیں لہٰذا اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں

---

[1] مشہور ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خاں صاحب نے جو لیاقت علی خاں مرحوم کی کابینہ میں اس وقت وزیر امور خارجہ تھے، اپنے محسن اور مربی اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

شرکت کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ جواب دیا گیا کہ کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح ناجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ کو منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچاتے ہیں اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح کریں اور اس کے بعد اس کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیئے یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو یہ اس پر واویلا کریں۔ اس میں آخر کیا معقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اعتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ امت قرار دے چکے ہیں لیکن وہ اس کے مقدرات کو اس لئے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسند عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ امت مسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ نیز حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں میں تناسب تعداد کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرمبادلہ کثیر مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب سے فوج، سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کی جو پہنچ اور دسترس حاصل ہے اس پر پابندی عاید ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آکاش بیل کی طرح شجر ملت سے چمٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی کے باعث ہوں۔ اسی لئے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو "مسلمان" ثابت کرنے کے لئے اپنے روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ موقف کے اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ امت اپنا تشخص تین چوتھائی صدی قبل ہی کر لیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ پر بہ ادنیٰ تامل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ انتہائی نرم، معقول اور بلکہ نیز ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اور اس طرح ان کو بین الاقوامی سطح پر MINORITY COMMUNITY کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان پر جو کچھ بیتتی اور ان کو نئی نبوت کے اجرا

اور اس کو ماننے کے جو نتائج بھگتنے پڑتے وہ ان کے لئے کہیں زیادہ سخت ہوتے۔ یہ تو لادینیت کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالعفل انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے اسی لئے ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے زمانے میں ہوا اور خلافت راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں ارتداد کی جو سزائیں دی جاتی رہیں ان کا ان سزاؤں سے واسطہ پڑتا۔ یہ تو اکبر الہ آبادی مرحوم کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ " انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!" — کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعاوی کئے گئے۔ حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جما دیئے گئے۔ اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر دے دیا، ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑ سکا بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ کرتے رہے اور اپنے خالص سازشی کردار اور "انجمن امداد باہمی" کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ نرم ترین اور انتہائی وسعت قلبی کا سلوک ہے جو امت مسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے جسد ملت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔"

(بقیہ از صـ۷۱)

بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے اگرچہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ " الدین النصیحۃ " کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں ان پر لامحالہ ہمیں تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا — آپ کی ذات سے ہمیں نہ عناد ہے نہ بغض، بلکہ ہم پروردگار سے آپ کی ہدایت اور مغفرت کی دعا ہی کرتے رہیں گے کہ " رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ "

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را !

تنظیمِ اسلامی کی تاسیس کے موقع پر

جماعتِ اسلامی کے متوسّلین اور سابقین

کی خدمت میں چند گذارشات

ماخوذ از "میثاق" دسمبر ۸۴ء

"تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک باضابطہ قافلہ تو ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو تشکیل پایا تھا (گویا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء کو اس کی زندگی کے دس سال پورے ہو جائیں گے) لیکن اُس کے لیے ذاتی فیصلے کا اعلان راقم الحروف نے ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایک اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر (جس کا افتتاح حضرت مولانا عبید اللہ انور مدظلہ نے فرمایا تھا) اپنی ایک طویل تقریر میں کر دیا تھا ـــــ راقم کی یہ تقریر "میثاق" کے ستمبر اور پھر اکتوبر و نومبر ۷۴ء کے مشترک شماروں میں شائع ہو گئی تھی۔ (اور اب "سرافگندیم" کے عنوان سے کتابی صورت میں طبع شدہ موجود ہے!) ـــــ مؤخر الذکر اشاعت کی تیاری کے فوراً بعد راقم کو سفرِ حج پر روانہ ہو جانا تھا لیکن پی آئی اے کی حج کی پروازوں میں تاخیر کی بنا پر "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۴ء کا "تذکرہ و تبصرہ" بھی راقم ہی نے تحریر کیا جو ایک نئی تشکیل کے پیشِ نظر ماضی بعید و قریب کے "بزرگوں" اور "دوستوں"

کی خدمت میں کچھ معروضات پر مشتمل تھا ــــ "تنظیم اسلامی" کے دس سالہ اجتماع کے موقع پر ان معروضات کی "بارِ دگر" اشاعت سینہ کے داغوں کو تازہ رکھنے کے علاوہ ع "میری تمام سرگزشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو!" کے مصداق سابقہ بزرگوں اور دوستوں کو ع "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!" کے مصداق بارِ دگر" پکارنا" بھی ہے!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پی آئی اے کی حج کی پروازوں کے پروگرام میں قدرے تاخیر کے طفیل ہمیں "میثاق" کے قارئین سے اس اشاعت کے ذریعے بھی ہمکلام ہونے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ "برآور ہر چہ اندر سینہ داری!" کے مصداق ہم اپنا ذہن پچھلی اشاعت میں پوری طرح کھول کر سامنے رکھ چکے ہیں اور ہمارے پاس اس میں اضافے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ گویا سطور ذیل کو گزشتہ شمارے کے "تذکرہ و تبصرہ" ہی کا "پس نوشت" (POST SCRIPT) سمجھنا چاہیئے۔

بعض لوگوں کو ہمارے بارے میں یہ خواہ مخواہ کا سوءِ ظن لاحق ہو گیا ہے کہ ہمیں جماعت اسلامی یا مولانا مودودی کی ذات سے کوئی عداوت یا دشمنی ہے، حالانکہ خدا گواہ ہے کہ ہمیں نہ جماعت اسلامی سے کوئی عداوت ہے نہ مولانا مودودی سے کوئی ذاتی رنجش یا دشمنی۔

جماعت اسلامی سے ہمارا اختلاف صرف طریق کار اور پالیسی کا ہے اور "طریق کار" کے بارے میں ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ یہ ایک خالص "اجتہادی مسئلہ" ہے جس میں اختلاف کی وسیع گنجائش موجود ہے اور اگرچہ ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم ہند اور بعد از تقسیم طریق کار میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک جماعت کی بعد از تقسیم پالیسی بھی نہ کفر ہے نہ شرک! ہمارے نزدیک تو، جیسا کہ ہم گزشتہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، اسلام کے احیاء اور ملت کی تجدید کا عمل نہایت وسیع الاطراف ہے اور اس میں قومی تحریکوں کا بھی ایک مقام ہے اور علماء کی مساعی کا بھی، علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت بھی ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بھی، تبلیغی جماعت

کا بھی ایک اہم حصّہ ہے اور جماعت اسلامی کا بھی! چنانچہ ہم نے جب ۱۹۶۶ء میں اپنی "تالیف" تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" شائع کی تو اس کے دیباچے میں بھی واضح طور پر عرض کر دیا تھا کہ:

"میرے نزدیک نہ مختلف مسلمان ملکوں کو جغرافیائی و وطنی وحدت مان کر ان کے بقاء و استحکام کی سعی و جہد کفر ہے اور نہ ہی مسلمان قوم کو ایک وحدتِ ملی مان کر اس کی فلاح و بہبود کی کوشش دائرہ اسلام سے خارج۔ لیکن تمام مقاصد میں سب سے اعلیٰ مقصد اور تمام کوششوں میں سب سے برتر کوشش اعلائے کلمۃ اللہ کا مقصد اور شہادت حق علی الناس کی کوشش ہے۔ یہ بات جس طرح آج سے پہلے صحیح تھی اُسی طرح آج بھی حق ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کی غرض تاسیس ہی یہ ہے کہ "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ"[1] اور "وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا"[2] اور آج جبکہ یہ اُمّت بحیثیت مجموعی اپنے اصل فرضِ منصبی کو نہ صرف یہ کہ ادا نہیں کر رہی بلکہ عملاً اس کے بالکل برعکس کوششوں میں مصروف ہے۔ اس اُمت میں سے صحیح راہ پر وہی ہیں جو کم از کم "وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"[3] کے مصداق بن جائیں۔

---

[1] سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۲: "تم ہو بہتر سب اُمّتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں۔ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔"

[2] سورہ بقرہ۔ رکوع ۱۷: "اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو اُمّت معتدل تاکہ ہو تم گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا۔"

[3] سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۱: "اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو" (ترجمہ شیخ الہند رح)

میرے نزدیک اگر آج سے پچیس سال قبل مسلمانانِ ہند تقریباً مجتمع ہو کر اپنے قومی و ملّی تشخص کے تحفظ اور غیر مسلم اقوام کے معاشی و تہذیبی تسلّط سے بچاؤ کی فکر کر رہے تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کی جدّوجہد میں مصروف تھے تو خود وہ کفر تھا اور نہ ہی آج اگر جماعت اسلامی نظریہ پاکستان کی سب سے بڑی علمبردار بن کر تحریک مسلم لیگ کی وراثت حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے تو یہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گئی ہے ــــ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جب قومی و ملّی بہبود کے لیے کام کرنے والے نہ پہلے کم تھے نہ آج مفقود ہیں وہاں اُس جگہ کو پُر کرنے والا کوئی نہیں رہا جو جماعتِ اسلامی نے اپنے انتقالِ موقف سے خالی کی ہے۔"

البتہ اپنے اس موقف پر ہم پورے وثوق کے ساتھ قائم ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے اساسی نظریات اور اس کے موجودہ طریق کار میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ اور یہی وہ واحد نکتہ ہے جس کی وضاحت کے لیے ہم نے وہ طویل بیان تحریر کیا تھا جو اب متذکرہ بالا تالیف کے نام سے شائع شدہ موجود ہے!

ہمارے اس بیان یا ہماری اس تالیف کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے عام اس سے کہ وہ جماعت کے اندر کا آدمی ہو یا باہر کا، وہ یہ مانے بغیر نہ رہ سکا کہ واقعۃً جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم موقف اور بعد از تقسیم طریق کار میں تضاد و تباین کے سوا کوئی نسبت موجود نہیں۔ اس کے بعد ایک عظیم اکثریت تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے تسلیم کیا کہ اگر جماعت اپنے طریق کار میں تبدیلی نہ کرتی تو آج "تجدید و احیاءِ دین" کی سعی و جہد کے بہت سے مراحل طے ہو چکے ہوتے اور "ہنوز روزِ اوّل" کی صورت ہرگز نہ ہوتی۔ البتہ ایک اقلّ القلیل تعداد ایسے لوگوں کی بھی نکلی جنہوں نے کہا کہ جماعت کا موجودہ طریق کار صحیح ہے پہلا غلط تھا! [1]

---

[1] مثلاً ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر جب جماعت اسلامی ہند کے ایک اہم رکن اور بمبئی کی جماعت کے امیر سے ملاقات ہوئی اور ان سے اس موضوع پر مفصّل گفتگو ہوئی تو آخر میں وہ بھنّا کر بولے کہ "ہمارے نزدیک جو کچھ مودودی صاحب اب کر رہے ہیں وہ درست ہے اور ان کا تقسیم ہند کے قبل کا موقف غلط تھا!" تو راقم نے بحث کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مسئلہ زیر بحث

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

دوسرے دلائل و شواہد سے قطع نظر خود مولانا مودودی نے ستمبر ۱۹۴۸ء ہی میں اس فرق کو تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ اُس ماہ کے 'ترجمان' میں 'رسائل و مسائل' کے تحت مولانا نے فرمایا تھا کہ "واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے" اور کہ "ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں!" اس میں اگر صرف اس بات کا اضافہ کر لیا جائے کہ اپنی اس تحریر میں مولانا نے جس طریق کار کو صرف "دوسرا راستہ" قرار دے کر چھوڑ دیا تھا تقسیم سے قبل اسی کو "واحد طریق کار" کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اور پورے چھ برس اس پر حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم استقامت بھی اختیار کیے رکھی تھی تو ہمارے موقف کی مکمل ترجمانی ہو جاتی ہے۔

ہمارے اس موقف کا ایک دوسرا 'داخلی شاہد' وہ واقعہ ہے جو ہمیں حال ہی میں جماعت اسلامی پاکستان کے ایک اہم رکن کی زبانی معلوم ہوا — یعنی یہ کہ بھارت کی جماعت اسلامی بھی باقاعدہ و باضابطہ دو حصوں میں منقسم ہو چکی ہے جن میں سے ایک کا نام ہے "آل انڈیا جماعت اسلامی" اور دوسری کا نام ہے "جماعت اسلامی ہند!" اگرچہ اس کی تفاصیل ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئی ہیں کہ یہ تقسیم کس بنا پر ہوئی لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہاں بھی پالیسی اور طریق کار کے بارے میں شدید اختلاف موجود تھا لہٰذا اندازہ یہی ہے کہ یہ درحقیقت اسی کا شاخسانہ ہے۔

پاکستان میں بھی بعینہٖ یہی صورت پیش آتی۔ اگر مولانا مودودی کی بھاری شخصیت میدان میں موجود نہ ہوتی۔ چنانچہ ۵۷-۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ میں پالیسی

(حاشیہ : پچھلے صفحے سے پیوستہ)

کے نصف حصے پر ہمارا اتفاق رائے ہو گیا ہے، بقیہ نصف حصے پر بحث پھر کریں گے!"

— اسی طرح ۱۹۵۸ء میں جب مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ راقم کو سمجھانا چاہا تو اپنی گفتگو کا آغاز اس جملے سے کیا کہ "جہاں تک مولانا مودودی کے قبل از تقسیم ہند کے نظریات کا تعلق ہے مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے!" اس پر میں نے عرض کیا کہ "میرے اور آپ کے مابین گفتگو کی کوئی مثبت اساس ہی موجود نہیں اس لیے کہ میری ساری دلچسپی مودودی صاحب کے ان ہی نظریات سے ہے!"

اور طریق کار کے مسئلے پر باقاعدہ دو گروپ وجود میں آگئے تھے اور بہترین صورت یہی تھی کہ دونوں گروپ خوشدلی کے ساتھ علیحدہ ہو کر اپنے اپنے طریق کار پر عمل پیرا ہو جاتے۔ لیکن مولانا مودودی نے اپنی شخصیت کا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈال دیا۔ نتیجتہً دوسرے گروپ کے لوگ ؏

"کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!"

کے مصداق مایوس اور بددل ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور ان کی شکستہ خاطری نے انہیں فوری طور پر مجتمع ہو کر کسی مثبت تعمیری کام میں لگ جانے کے قابل بھی نہ چھوڑا۔

یہاں یہ بات بھی واضح طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ پالیسی کے بارے میں اختلافی نقطۂ نظر کے حامل صرف وہی نہیں تھے جو اس وقت جماعت سے علیحدہ ہو گئے بلکہ اور بھی بہت سے لوگ تھے جو اس ہنگامی صورتِ حال کے باعث جو اس وقت پیدا ہو گئی تھی شش و پنج میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے تو مختلف مراحل پر علیحدگی اختیار کر لی اور بعض جماعت کے اندر تو رہے لیکن پالیسی اور طریق کار کے بارے میں ذہنی اُلجھاؤ کے باعث عملاً عضوِ معطل بن کر رہ گئے! اور اس طرح خلوص و اخلاص کا بہت سا سرمایہ اور قوتوں اور صلاحیتوں کا ایک بڑا اثاثہ اس شعر کے مصداق بے کار ہو کر رہ گیا کہ ؎

تری رہبری کا یہ فیض ہے تدم اہلِ شوق کے رُک گئے
نہ کوئی جوازِ سفر ملا نہ کوئی دلیلِ قیام ہے!!

۱۹۶۷ء میں 'تنظیم اسلامی' کے قیام کی سعی درحقیقت اسی غرض سے تھی کہ خلوص و اخلاص کے اس سرمائے اور قوتوں اور صلاحیتوں کے اس اثاثے کو کسی مثبت تعمیری جدوجہد میں لگایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے داعیوں میں سے تین حضرات وہ تھے جو ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے اور جماعت کے اندر انہیں جو مقام حاصل تھا، وہ اس سے ظاہر ہے کہ تینوں مولانا مودودی کی امارت و نظربندی کے مختلف مواقع پر جماعت اسلامی پاکستان کی امارت کے منصب پر فائز رہے تھے، یعنی مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب ـــــ اور تین وہ تھے جو بعد میں مختلف مراحل پر علیحدہ ہوئے یعنی مولانا عبدالحق حامی، سردار محمد اجمل خاں لغاری اور

ڈاکٹر محمد نذیر مسلم ـــــ اور سات میں کا ساتواں، تھا ان سطور کا راقم جو اگرچہ علیحدہ تو ۵۷ء ہی میں ہو گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ علم اور تجربے دونوں کے اعتبار سے وہ نہ ۵۷ء میں کسی شمار قطار میں تھا اور نہ ۶۷ء میں!

لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی کچھ خارجی مخالفت اور زیادہ تر اندرونی سبوتاژ کا شکار ہو گئی اور اپنے پیچھے مایوسی اور دل شکستگی کے گہرے سائے چھوڑ گئی۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ طے کر لیا کہ باقی تمام مہلتِ عمر اور کل قوت و صلاحیت تفسیر تدبر قرآن کی تحریر و تسوید کے لیے وقف کر دیں گے۔ مولانا عبدالغفار حسن نے مستقل ڈیرہ حجاز مقدس میں لگا لیا کہ ایک خالص دینی اور علمی شغل پر مستزاد سعادتِ مجاورت حرمین شریفین تو میسر ہے، وقس علیٰ ہذا۔

نتیجتاً اب پورے سات برس بعد "سات میں کے ساتویں" کو ہمت کرنی پڑی ہے کہ وہ کھڑا ہوا اور اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرے جو تقسیم ہند کے موقع پر جماعت اسلامی کے انتقال موقف کے باعث پیدا ہوا تھا اور تا حال پُر نہیں کیا جا سکا۔

اس موقع پر اوّلین گزارش تو ہمیں ان حضرات سے کرنی ہے جو ۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کی سعی میں بحیثیت داعی شریک تھے اور وہ یہ کہ یہ درحقیقت آپ ہی کا کام ہے، جسے راقم الحروف لے کر کھڑا ہوا ہے وہ اپنے بارے میں ہرگز کسی کبر یا عجب میں مبتلا نہیں اور اب بھی وہ اپنے آپ کو "سات میں کا ساتواں" اور آپ حضرات کو اپنا بڑا اور بزرگ ہی سمجھتا ہے۔ سامنے وہ اس لیے آ گیا کہ اس کے سوا اب اُسے کوئی اور چارۂ کار نظر نہیں آیا۔ اس کا یہ مقام تو ہرگز نہیں کہ وہ آپ حضرات سے کہے کہ "آؤ اور میرا ساتھ دو!" خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اس کے بعض خیالات سے آپ حضرات متفق بھی نہیں ہیں! البتہ دو باتوں کا متمنی وہ ضرور ہے۔ ایک یہ کہ آپ حضرات اس کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کام میں اس کی رہنمائی بھی فرمائے اور تائید بھی اور دوسرے یہ کہ اسے کم از کم اپنے مخلصانہ مشوروں سے ضرور نوازتے رہیں ـــــ وہ آپ کے مشوروں کا تو محتاج ہے ہی تنقید کا بھی خیر مقدم کرے گا! اس سے بڑھ کر اگر آپ "دامے، درمے، سخنے" اس کی مدد بھی فرمائیں تو یہ آپ کا حد درجہ ایثار ہو گا جس کا اجر آپ اپنے رب سے پائیں گے، رہا وہ تو اس کا حال تو "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" کا کامل مصداق ہے۔

اور وہ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے تہی دست و محتاج سمجھتا ہے۔!!

یہاں قارئین "میثاق" کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا غالباً نامناسب نہ ہو گا کہ راقم نے چند ہی دن قبل مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی دو درخواستیں پیش کیں تو انہوں نے کمال شفقت سے ان دونوں کو قبول فرما لیا اور فرمایا کہ "تم نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی لیکن اب جبکہ تم نے بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس میں تمہیں کامیاب کرے۔ ہمیں اپنے دوسرے بزرگوں سے بھی اسی کی توقع ہے اور ان شاء اللہ العزیز ہمیں اس معاملے میں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا ہو گا۔!

ثانیاً ان تمام حضرات سے جو مختلف اوقات میں پالیسی اور طریق کار کے اختلاف کے باعث جماعت سے علیحدہ ہوئے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ مایوسی اور دل شکستگی سے دامن چھڑائیں اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو مجتمع (POOL UP) کر کے اسی طرز پر سعی و جہد میں لگ جائیں جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں۔

اس ضمن میں راقم اپنی ان ہی گزارشات کے دہرانے کو کافی سمجھتا ہے جو ۱۹۶۶ء میں 'تنظیم اسلامی' کے قیام کے فیصلے کے بعد 'میثاق' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت کے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں پیش کی گئی تھیں :۔

> "اجتماع رحیم یار خان کے دوران بہت سے پرانے رفقاء سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا تو راقم الحروف کے اس خیال کو مزید تقویت حاصل ہوئی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے ایسے حضرات کو چھوڑ کر جو اپنی کسی ذاتی مجبوری کی بنا پر علیحدہ ہوئے یا کسی دینی و اخلاقی کمزوری کے سبب سے علیحدہ کر دیے گئے، پالیسی اور طریق کار سے اختلاف کی بنا پر جتنے لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے چاہے وہ حال ہی میں علیحدہ ہوئے ہوں، چاہے آج سے دس سال قبل اور چاہے اس سے بھی پہلے، ان سب کا طرزِ فکر تقریباً یکساں اور سوچنے کا انداز بہت حد تک مشابہ ہے۔ ان کے نقطۂ نظر میں تھوڑا بہت فرق اگر ہے بھی تو صرف اس اعتبار سے کہ کسی کے نزدیک اختلاف کا کوئی ایک پہلو اہم تر ہے اور کسی کے نزدیک کوئی

دوسرا، یا آخری تجزیے میں کسی کے خیال میں اصل غلطی کوئی سی ہے اور کسی کے خیال میں غلطی کا اصل سبب کوئی دوسرا ہے — پھر کچھ اسی بنا پر اور کچھ ذاتی رجحانات اور ذوق کے فرق کی بنا پر کسی کے صبر کا پیمانہ کسی مرحلے پر لبریز ہُوا اور کسی نے کسی دوسرے مرحلے پر طے کیا۔ کہ اب مزید ساتھ چلنا ممکن نہیں۔ چنانچہ مختلف اوقات میں علیحدگی کے وقت علیحدگی کے جو اسباب بیان ہوئے وہ بھی لازماً ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف تھے — بایں ہمہ تھوڑے سے تبادلہ خیال اور باہمی گفتگو سے یہ حقیقت دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ فی الواقع سب کا طرزِ فکر اور نقطۂ نظر تقریباً یکساں ہے اور مختلف کڑیوں کے جوڑنے سے جو مکمّل نقشہ بنتا ہے وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے — !!

بدقسمتی سے ماضی میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے مابین نقطہ نظر کے اس باریک فرق پر جو مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر پیدا ہُوا تھا کچھ تو رفتارِ خود بھی زیادہ زور دیتے رہے اور کچھ باہر کے لوگوں نے اسے زیادہ ہی شہرت دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تِل کا پہاڑ بن گیا ؎

کچھ تو ہوتے بھی ہیں الفت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ دیوانہ بنا دیتے ہیں

چنانچہ کبھی یہ کہا گیا کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والوں میں سے کوئی دو افراد بھی باہم متفق نہیں ہیں — کبھی یہ پھبتی چُست کی گئی کہ ان میں سے ہر شخص لیڈر ہے!" اور کبھی اپنے معتقدین کو یہ دلاسا دیا گیا کہ "آپ مطمئن رہیں، خوارج، کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔" اور ان باتوں کا واقعتہً کچھ ایسا نفسیاتی اثر پڑا کہ خود علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بعض اس بات سے مایوس ہوتے چلے گئے کہ وہ دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے جمع ہو سکتے ہیں!

اوّل تو جو لوگ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے وہ سیاست بازی کے کسی کھیل کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے بلکہ جماعت میں ان کی شمولیت

ایک خالص دینی مقصد کے تحت اور اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے تھی لہٰذا جب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کے لیے جماعت میں شامل رہنا ممکن نہ رہا تو یہ حادثہ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے عمر عزیز کے دس دس، پندرہ پندرہ بلکہ سترہ سترہ سال اس کی نذر کیے تھے کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، ان پر صدمے کی کیفیت کا طاری ہونا بالکل فطری تھا۔ پھر جماعت کے مخصوص تنظیمی ڈھانچے کی بنا پر ان میں سے ہر ایک نے ہر مرحلے پر اپنا لائحہ عمل خالصتہً اپنی ذاتی صوابدید پر طے کیا۔ چنانچہ کوئی کسی مرحلے پر کارواں سے ٹوٹا اور کوئی کسی مرحلے پر بدگماں ہوا اور مختلف لوگ مختلف اوقات میں جماعت سے الگ ہوئے — بنابریں ان کا فوری طور پر کسی نئے نظم میں منسلک ہونا خارج از امکان تھا۔ بعد میں جوں جوں وقت گزرا روابط قائم ہوئے اور افہام و تفہیم کے مواقع نہ رہے تو نقطۂ نظر کا وہ باریک سا فرق جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اہمیت اختیار کرتا چلا گیا ہر شخص کی سوچ اپنے ہی زاویے پر آگے بڑھتی گئی اور بعض اوقات بالکل متضاد باتیں بھی سنائی دینے لگیں — چنانچہ شناختِ ہمسایہ کے لیے بنیاد فراہم ہو گئی — اور وہ سب کچھ کہا گیا جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔!

اس داستان کو دہرانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ بعض رفقاء کے ذہنوں پر جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کے باہمی اختلافات کے چرچے کا خاصا اثر ہے اور اس امر کی واقعی ضرورت ہے کہ ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے ذریعہ ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ہی روابط استوار ہوتے ہیں باہم افہام و تفہیم کا موقع ملتا ہے۔ اور مابہ الاختلاف مسائل کے ساتھ ساتھ ان وسیع تر اور اہم تر امور پر نظر کی جاتی ہے جن میں کامل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور جن کی بنا پر سب لوگ دس دس، پندرہ پندرہ اور بعض حالات میں سترہ سترہ سال ایک ہی اجتماعیت میں فعال کارکنوں کی حیثیت سے شریک رہے تھے تو "اختلاف" نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے اور وہ کیفیت

پیدا ہو جاتی ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جتنی بڑی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص کو انفرادی طور پر جوابدہی کرنی ہے، (وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا) اتنی ہی بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں انسان منفرد نہیں پیدا کیا گیا بلکہ ایک اجتماعیت کے جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اجتماعیت اس کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے ـــــ خصوصاً اس دور میں جبکہ اجتماعیت اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور باطل پوری طرح منظم اور مجتمع ہے۔ حق اور اہلِ حق کے لیے اجتماعیت سے گریز کسی طرح بھی مناسب نہیں ـــــ

بنا بریں ہم اپنے تمام رفقاء اور بزرگوں کی خدمت میں یہ گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ وقت کے فرض کو پہچانیں اور اس کی آواز پر لبیک کہیں اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو مجتمع کر کے حق کے اظہار اور اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس کے لئے اگر اپنے ذاتی رجحانات اور انفرادی ذوق بلکہ ذاتی خیالات و نظریات تک میں کسر و انکسار کا کسی قدر ایثار کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کریں ـــــ اللہ تعالیٰ اس پر انہیں یقیناً اجر دے گا۔ ویسے ہم علیٰ وجہ البصیرت یہ جانتے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی محض ابتدا ہی میں ہو گی ـــــ اور جیسا کہ عرض کیا گیا روابط کے از سرِ نو استوار ہوتے ہی اختلاف کا سارا افسوں لوٹ کر رہ جائے گا!۔"

آخر میں جماعت اسلامی کے احباب کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ وہ ہمیں اپنا دشمن، نہ سمجھیں اور مولانا مودودی کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ ہمارے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ "اختلاف" کو اس کی حقیقی اور واقعی نوعیت تک محدود رکھیں[1]۔ اس ضمن میں بھی ہم اب کچھ مزید کہنے کی بجائے "میثاق" کے محولہ بالا شمارے

---

[1] راقم کو بہت دُکھ ہُوا یہ معلوم کر کے کہ جماعت کے حلقوں میں یہ خبر... (باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہی سے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں :

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گزارش راقم الحروف جماعت اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تقریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہوگی لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دلآزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہار دین حق اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا — اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمر عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد کی نذر کیے — پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلمبند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں۔ آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو ضرور پڑھ لیں" ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیر جماعت

حاشیہ : پچھلے صفحے سے پیوستہ

گشت کر رہی ہے کہ راقم دراصل حکومت پاکستان کے سرکاری حج وفد کے ساتھ حج کے لیے جا رہا ہے۔ پہلے جب ایک صاحب نے اس کا ذکر کیا تو راقم نے اسے مذاق سمجھا اور قطعاً اہمیت نہ دی۔ لیکن گزشتہ اتوار کو درسِ قرآن کے بعد مسجد شہداء میں دو حضرات نے فرمایا کہ یہ بات علماءِ کرام کی ایک مجلس میں کہی گئی جہاں مولانا مودودی بھی موجود تھے تو باور ہی کرنا پڑا کہ کسی کو واقعتہً کوئی مغالطہ لگا ہے۔ لیکن ساتھ ہی سخت صدمہ ہوا کہ اگر ہمارے علماءِ کرام بھی اس درجہ غیر محتاط ہیں تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے ؎

"چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟"

کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر میں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا!"

لیکن پھر جب کچھ آپ کی عنایتوں میں مزید اضافہ ہُوا اور آپ نے اہل اختلاف پر ضعف ارادہ بسیط اور ضعفِ ارادہ مرکب کی پھبتیاں چُست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہُوا کہ جماعت میں ایک عضوِ معطّل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سُود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: "میں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و منتسب مجھ سے حقیقی محبّت کا تعلّق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا — !" علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلّق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیّت کا اظہار بھی کیا تھا — افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلاف کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلّق کی بدولت دل کی یہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دُوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اب خلافت و ملوکیت لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اس کی وجہ سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کا پسیجنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! بایں ہمہ اب جبکہ ہم، آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مند دین کی چھوٹی

(بقیہ صـ۵۸)

اِن شاء اللہ اِس سال قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء روزانہ بعد نماز مغرب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام سالانہ

محاضراتِ قرآنی

کا موضوع :

"قرآن کا تصوّرِ فرائضِ دینی"

ہو گا، جس میں ان شاء اللہ العزیز جملہ مکاتبِ فکر کے جیّد علماءِ کرام حصّہ لیں گے۔

ذیلی عنوانات عبادتِ رب، شہادت علی النّاس، اقامتِ دین
جہاد فی سبیل اللہ، التزامِ جماعت، بیعتِ سمع وطاعت

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے !

"تنظیمِ اسلامی" کے دسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر منعقد ہونے والے محاضراتِ قرآنی کا موضوع:

فرائضِ دینی کا جامع تصوّر

اور اس پر ــــــ اصحابِ علم وفضل کو

دعوتِ تنقید و ہدایت!

ــــــ از ــــــ

ڈاکٹر اسرار احمد، امیر تنظیمِ اسلامی

عریضہ بنام علماءِ کرام

محترم ومکرم جناب ــــــــــــ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ــــ مزاج گرامی!

جنابکے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالبِ علم اور اس کے دینِ متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر ہے۔ اور ایک دینی جماعت "تنظیمِ اسلامی" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام شرکار، ظاہر ہے کہ، راقم ہی کے دروسِ قرآن، اور تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو کر راقم کے معاون ومددگار بنے ہیں ــــ لیکن، والحمدللہ، کہ راقم کا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و

معاونین کو صرف اپنے ہی فہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں، بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں ـــــ چنانچہ انجمن کے زیر اہتمام جو سالانہ 'قرآن کانفرنسوں' اور 'محاضراتِ قرآنی' کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیشِ نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقاءِ تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں 'علیٰ وجہ البصیرت' چلیں!

آئندہ ماہ، ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء ایسا ہی موقع آرہا ہے۔ چنانچہ ان ایام میں، ان شاء اللہ العزیز 'قرآن اکیڈمی'، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیمِ اسلامی پاکستان کے رفقاء کے خصوصی اجتماعات ہوں گے اور روزانہ بعد نماز مغرب انجمن کے زیر اہتمام 'محاضراتِ قرآنی' کے عنوان سے عمومی مجالس ہوں گے۔

اس موقع پر 'محاضراتِ قرآنی' کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحابِ علم و فضل کو اپنے دینی فکر، بالخصوص 'تصورِ فرائض دینی' پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی نشاندہی فرمائیں، بصورتِ دیگر تائید و تصویب سے نوازیں، ـــــ اس مقصد کے لئے راقم نے اپنی دینی سوچ، خصوصاً اپنے تصورِ فرائضِ دینی کا ایک 'خلاصہ' مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جناب سے درخواست ہے کہ اس کا بغور مطالعہ فرما کر ـــــ جناب پسند فرمائیں تو اس پر بحیثیتِ مجموعی خطاب فرمائیں، اور مناسب خیال فرمائیں تو اس کے کسی ایک جزو کو اپنے خطاب کے لئے منتخب فرمالیں ـــــ مزید گذارش ہے کہ اگر جناب اپنے خیالات تحریراً پیش فرما سکیں تو راقم اور اس کے رفقاء کے مستقل استفادے کی صورت بن جائے گی، اور تقریر کی صورت میں بھی اگر

اسکا خلاصہ جناب خود مرتب فرمادیں گے تب بھی افادیت زیادہ ہوگی ـــــ تاہم آپ کی شمولیت ہمارے لئے ہر حال میں مفید ہوگی ۔

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرمالیں گے راقم کا تصوّر فرائض دینی چھ عنوانات کے ذیل میں مندرج ہے : تین اساسی فرائض، اور تین ان کے لوازم ، ـــــ اِدھر محاضرات بھی ان شاء اللہ چھ لوم جاری رہیں گے بناء بریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیر بحث آئے ، چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہار خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنالیں تو انسب ہوگا ، اگر بحیثیت مجموعی پورے تصوّر فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دن کی جاسکے گی ۔ بہرحال اس ضمن میں کوئی چیز بھی 'شرط' کے درجے میں نہیں ہے !

اسی طرح 'ان شاء اللہ العزیز' سوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا ـــــ اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک 'استفادے' کی کوشش کریگا اور صورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی ۔

آخر میں جناب سے مؤدّبانہ گذارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لئے ضرور وقت نکالیں ۔ اس لئے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی ، خصوصاً جبکہ اُس کا محرّک و داعی خود اس کے لئے مستدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے ! ـــــ بصورتِ دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالےٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجّت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجّہ نہ فرمائی ، فقط والسلام مع الاکرام ۔

رہنمائی کا طالب ، خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

لاہور - ۱۲ر فروری ۸۵ء

میرے تصوّرِ فرائضِ دینی کا خلاصہ

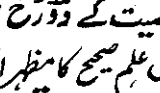

★ **تمہید:** انسانی شخصیت کے دو رُخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل
اسلام میں علمِ صحیح کا مظہرِ اتم 'ایمان' ہے۔
جبکہ عملِ صحیح کی اساس 'تصوّرِ فرائض' پر قائم ہے۔
'ایمان' انسان کو علمِ حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرّکِ عمل بھی دیتا ہے، اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے، چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصُول کے ذرائع اور اس کے لوازم و ثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ 'تصورِ فرائضِ دینی' پر ہے!

★ راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے **'اساسی دینی فرائض' تین ہیں:**

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لئے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعتِ خدا و رسُولؐ، تقویٰ اور **عبادت** ۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جُزوی یا جز وقتی —— اِلّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہوکر کوئی غلط حرکت سرزد ہوجائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہوگی (النساء: ۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک 'معصیت' بھی مستقل طور پر اختیار کرلی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے، حتّٰی کہ 'خلود فی النار' تک

کا اندیشہ ہے (البقرہ : ۸۱) الّا یہ کہ حقیقی اور واقعی 'اِضطرار' ہو !!

(۲) دوسرے یہ کہ دُوسروں کو حتیّٰ المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے !

☆ اس کے لئے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار، تبشیر، تذکیر، وعظ، نصیحت، وصیّت، تعلیم، تبیین، تلقین،

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں : تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی النّاس۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروّت کا تقاضا بھی ہے اور اَبنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سیّد المرسلین **محمدؐ** رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ختمِ نبوّت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسُولؐ کی جانب سے اتمامِ حجّت یعنی "شہادت علی النّاس" کی ذمّہ داری بحیثیتِ مجموعی اُمّتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے !

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اسؑ کے دینِ حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

★ اس کیلئے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں : تکبیرِ ربّ، اِقامتِ دین، اظہارُ دینِ الحق علی الدّین کلّہ، اور 'لیکون الدین کلہٗ للہ'

★ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے : لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا — اور

★ تین عام فہم تعبیرات ہیں : قیامِ حکومتِ الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی، اور اِسلامی انقلاب !

متذکرہ بالا تین۳ فرائض کی باہمی نسبت اور اُنکے ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط و تعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہوجاتا ہے جس کی ۔ (i) ایک زیرِ زمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارو مدار اسی پر ہے ۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصّہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں "کرسی" اور انگریزی میں کہتے ہیں ۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں، ظاہر ہے کہ اوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (vi) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے ـــــــ!

اس مثال میں : (ا) زیرِ زمین بنیاد ـــ ایمان کا "تصدیقٌ بالقلب" والا حصّہ یعنی یقینِ قلبی ہے ! (ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصّہ ـــــــ "اقرارٌ باللّسان" ـــــ یعنی کلمہ شہادت ہے ! (ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ۔ (د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے (ھ) دوسری چھت ـــ تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی النّاس سے عبارت ہے ـــــ اور (و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ ربّ، اقامتِ دین، اظہارِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللّٰہ یا قیامِ حکومتِ الٰہیّہ کی مظہر ہے! واللّٰہ اعلم!!

★ اِن تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے تین۳ لوازم لابدّ منہ ہیں :

(۱) دوامِ "جہاد فی سبیل اللّٰہ" جس کا ظہور :

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں (i) نفسِ امّارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذرّیتِ صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ ـــــــ کے خلاف جدّوجہد اور زور لگانے

کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیثِ نبویؐ کی رُو سے یہی "افضل الجہاد" ہے۔

★ فریضۂ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لئے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے "بالفعل" اور "بالید" پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لئے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دیدینے کی "آرزو" کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے!

واضح رہے کہ اِسی کا "منفی پہلو" "ہجرت" ہے،

چنانچہ اسکی بھی پہلی منزل "اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ" ہے اور آخری یہ کہ اقامتِ دین کی جدّوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکل جایا جاتے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لئے اصل آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی "جہاد بالقرآن" چنانچہ "مجاہدہ مع النفس" کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجّد!

اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اور اسی کے ذریعے ہونا چاہیئے!!۔

تیسری اور آخری منزل پر عہد حاضر میں "جہاد بالید" کی سوزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پُرامن

مظاہرے ہیں، لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت، قتال یعنی 'جہاد بالسیف' تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت، جس کا تقاضا:

★ فریضۂ اوّل کے ضمن میں صرف صحبتِ صالح (للفحوائے: کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ) سے بھی پورا ہو سکتا ہے!

★ اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں، اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہو سکتا ہے!

★ لیکن فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'سمع وطاعت فی المعروف' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا (اور یہی مراد ہے آنحضورؐ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: "اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ"
(احمدؒ والترمذیؒ عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) 'بیعت' — جو: —

★ پہلے دو فرائض کے ضمن میں 'بیعتِ سلوک وارشاد' کی صورت میں کفایت کرتی ہے۔ لیکن

★ فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف' کی صورت لازمی ولابدی ہے! چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلم کی روایت (عن عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوتے ہیں کہ "مَنْ مَّاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَیْعَةٌ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً" — ! — واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (۱) اگر کم سے کم شرائط ومعیارات پر اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اس کے سربراہ سے

بیعت سمع وطاعت ہوگی ـــــ اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع وطاعت ہوگی ـــــ اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں!

★ **چنانچہ: (۱) 'انجمن خدّامُ القرآن' کا مقصد ہے 'جہاد بالقرآن'**، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو 'اغراض ومقاصد' معین ہوئے وہ یہ تھے: (۱) عربی زبان کی تعلیم وترویج (۲) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب وتشویق (۳) علوم قرآنی کی عمومی نشرواشاعت، (۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو تعلیم وتعلمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں ـــــ اور (۵) ایک ایسی 'قرآن اکیڈمی' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے، اور

(۲) 'تنظیمِ اسلامی' ہے 'جملہ دینی فرائض' کی انجام دہی کے لئے 'بیعتِ ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف' پر مبنی خالص دینی جماعت!!

میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے اب علماءِ کرام اور اصحابِ دانش کا فرض ہے کہ رہنمائی فرمائیں! خاکسار اسرار احمد

(نوٹ)

مندرجہ بالا خط مع 'خلاصۂ تصورِ فرائضِ دینی' حسب ذیل حضرات کو ارسال کیا گیا ہے:

مولانا سید حامد میاں صاحب لاہور	مولانا عبید اللہ انور صاحب لاہور
مولانا محمد مالک کاندھلوی صاحب "	حافظ عبد القادر روپڑی صاحب "
مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب "	مولانا محمد حنیف ندوی صاحب "
مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی صاحب "	مولانا محمد متین ہاشمی صاحب "
مولانا سعید الرحمٰن علوی صاحب "	علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب "

مفتی غلام سرور صاحب لاہور
نعیم صدیقی صاحب 〃
مولانا اسعد گیلانی صاحب 〃
جسٹس ملک غلام علی صاحب۔
مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب کراچی
مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب 〃
مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی 〃
مولانا مولانا عبدالوکیل صاحب خطیب 〃
مولانا منتخب الحق قادری صاحب 〃
مولانا مفتی دلی حسن صاحب
مولانا وصی مظہر ندوی صاحب حیدرآباد
مولانا احمد سعید کاظمی صاحب ملتان
مفتی زین العابدین صاحب فیصل آباد
مفتی سیاح الدین کاکاخیل صاحب 〃
مولانا اسحٰق چیمہ صاحب 〃
علامہ عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری گجرات
مولانا محی الدین لکھوی صاحب اوکاڑہ
مولانا خان محمد صاحب میانوالی
مولانا سمیع الحق صاحب اکوڑہ خٹک
مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب 〃
مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب لکھنو
مولانا تقی امینی صاحب علی گڑھ
مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلی
مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب ناگپور
جناب شمس پیرزادہ صاحب بمبئی
مولانا اللہ بخش ابازملکانوی صاحب ملتان

علامہ محمود احمد رضوی صاحب لاہور
علامہ طاہر القادری صاحب 〃
پروفیسر حافظ احمد یار صاحب 〃
حافظ عبدالرحمٰن صاحب مدنی 〃
جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب کراچی
مولانا محمد اسحٰق صاحب روپڑی 〃
مولانا محمد طاسین صاحب 〃
ڈاکٹر غلام محمد صاحب 〃
مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی 〃
مولانا سلیم اللہ خان صاحب 〃
شاہ بدیع الدین پیر آف جھنڈا سندھ
مولانا محمد ازہر صاحب ملتان
حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب فیصل آباد
مولانا عبدالغفار حسن صاحب 〃
ڈاکٹر محمد نذیر مسلم صاحب رحیم یار خاں
مولانا محمد طاہر صاحب پنج پیر
مولانا گوہر الرحمن صاحب مردان
جسٹس پیر کرم شاہ صاحب سرگودھا
مولانا محمد عبداللہ صاحب اسلام آباد
مولانا الطاف الرحمن بنوی صاحب ضلع بنوں
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب لکھنو
مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی
مولانا وحید الدین خاں صاحب دہلی
قاری قطب الدین صاحب حیدرآباد
قاری عبدالحلیم صاحب 〃
قاری تقی الدین صاحب 〃

****

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

امیر کی اطاعت

بشکریہ "جماعت المسلمین"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو امراء ہوں ان کی اطاعت کرو۔

(النساء : ۵۹)

اس آیۂ مبارکہ سے اولوالامر یعنی امراء کی اطاعت فرض ہوئی۔ اس آیت میں امراء کے ساتھ حکومت کی کوئی شرط اللہ تعالیٰ نے نہیں لگائی۔ لہٰذا ہر امیر کی اطاعت فرض ہے۔ اپنی طرف سے حکومت کی شرط کتاب اللہ پر زیادتی ہے اور یہ کفر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ یُّطِعِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ یَّعْصِ الْاَمِیْرَ فَقَدْ عَصَانِیْ۔	جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء۲ ۔ ص۱۲۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر امیر کی اطاعت فرض ہے۔ امیر کی اطاعت کے لئے حدیث میں کوئی شرط نہیں ہے۔ اپنی طرف سے حکومت کی شرط لگانا شریعت سازی ہے اور یہ شرک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ کَرِہَ مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئًا فَلْیَصْبِرْ فَاِنَّہٗ مَنْ خَرَجَ مِنَ	جس شخص کو امیر کی کوئی بات ناگوار گذرے تو صبر کرے۔ کیونکہ جو شخص

السُّلْطَانِ شِبْرًا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً

سلطان سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہوا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی

(صحیح بخاری کتاب الفتن باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم سترون بعدی امورًا تنکرونھا جزء ۹ ص۹۵ وصحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ ص۱۳۲)

سلطان کے معنی دلیل، حجت، اختیار اور قوت کے ہیں - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ (ھود: ۹۶)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور روشن دلیل کے ساتھ بھیجا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطَانًا (بنی اسرائیل ۳۳)

اور جو شخص ظلم کے ساتھ قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ وہ بدلہ لے لے)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝

(الرحمٰن ۳۳)

اے جنات اور انسانوں کی جماعت اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ (لیکن) تم نہیں نکل سکتے بغیر قوت کے۔

حدیث مذکور کے پہلے جزء میں امیر کا لفظ ہے اور دوسرے جزء میں سلطان کا لفظ ہے۔ جو امیر ہی کے لئے استعمال ہوا۔ کیونکہ امیر کو اپنے عہدۂ امارت کی وجہ سے ایک قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے اور کیونکہ اس کا حکم مامورین پر حجت ہو جاتا ہے اسی لئے اسے سلطان کہا گیا ہے۔ بادشاہ کو بھی اسی لئے سلطان کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں قوت ہوتی ہے اور اس کا فرمان رعایا پر حجت ہوتا ہے۔

الغرض ہر امیر کی اطاعت فرض ہے اور اس کی اطاعت سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہونا ناجائز ہے۔ امیر ہی کی وجہ سے جماعت میں تنظیم اور تنظیم میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر امیر کی اطاعت نہ کی جائے تو تنظیم کی قوت جاتی رہے گی۔ امیر ہی جماعت کی قوت کا مرکز ہے اور اس مرکزیت ہی

کی وجہ سے وہ خود ایک قوت اور سلطان ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ رَاٰی مِنْ اَمِیْرِہٖ شَیْئًا یَکْرَھُہٗ فَلْیَصْبِرْ عَلَیْہِ فَاِنَّہٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَۃَ شِبْرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً (صحیح بخاری کتاب الفتن جزء ۹ صـ۵۹ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ صـ۱۳۶)	جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس پر صبر کرے اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اور اسی حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

نوٹ: جاہلیت سے مراد اسلام سے پہلے کا زمانہ یعنی کفر کا زمانہ ہے ۔

اس حدیث کے پہلے جزء میں امیر کا لفظ ہے اور دوسرے جزء میں جماعت کا لفظ ہے گویا امیر کو چھوڑنا جماعت کو چھوڑنا ہے ۔

حضرت عبادہ ابن الصامت فرماتے ہیں :۔

دَعَانَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَایَعْنَاہُ فَقَالَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ بَایَعَنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِیْ مَنْشَطِنَا وَمَکْرَھِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا وَاَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ (صحیح بخاری کتاب الفتن جزء ۹ صـ۵۹ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صـ۱۳۲)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا پھر ہم سے بیعت لی ۔ آپ نے ہم سے جن باتوں پر بیعت لی وہ یہ تھیں کہ : (امیر کا حکم سننا اور اطاعت کرنا ، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی ، تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی اور ترجیح کی صورت میں بھی اور (اس بات پر بھی بیعت لی) کہ امیر سے (اس کے) امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کرنا سوائے اس صورت کے کہ تم (اس کو) صریح کفر (کرتے) دیکھو جس (کو کفر ثابت کرنے) کے لئے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل و برہان ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

اِسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ
(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب السمع و الطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ جزء ۹ ص۷۸)

(امیر کا حکم) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر کسی حبشی غلام ہی کو کیوں نہ (امیر) مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش (کے برابر) ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ اَوْ كَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ۔
(صحیح بخاری کتاب الاحکام جزء ۹ ص۷۸
و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ ص۱۳۱)

مسلم آدمی پر (امیر کا حکم) سننا اور اطاعت کرنا لازمی ہے خواہ اُسے وہ (حکم) پسند ہو یا ناپسند ہو (اس شرط کے ساتھ کہ) اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ امیر کی اطاعت فرض ہے۔ صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امیر گناہ کا حکم نہ دے۔ امیر کی اطاعت کے لئے حکومت کی شرط کسی حدیث میں نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتَ
(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب کیف یبایع الامام الناس جزء ۹ ص۹۶ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب البیعۃ علی السمع و الطاعۃ فیما استطاع جزء ۲ ص۱۳۲)

ہم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (حکم) سننے اور اطاعت کرنے پر بیعت کیا کرتے تھے تو آپ ہم سے فرماتے تھے کہ: "جہاں تک تم سے ہو سکے۔"

حضرت جریرؓ فرماتے ہیں:۔

بَايَعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فَلَقَّنَنِيْ فِيْمَا اسْتَطَعْتُ (صحیح بخاری کتاب الاحکام جزء ۹ ص۹۶)

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (حکم) سننے اور اطاعت کرنے پر بیعت کی تو آپؐ نے مجھے سکھایا (کہ اس طرح کہو) جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا (سنوں گا

اور اطاعت کروں گا)۔

مندرجہ بالا احادیث سے امیر کی اطاعت کی اہمیت آشکار ہے۔ امیر کی اطاعت کرنے پر بیعت لی جاتی تھی۔

حضرت ابوذر فرماتے ہیں :۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ	اے ابوذر! میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور
اِنِّیْ اَرَاکَ ضَعِیْفًا وَاِنِّیْ اُحِبُّ	(آدمی) ہو اور جو چیز میں اپنے لئے
لَکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَاتَأَمَّرَنَّ	پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے
عَلٰی اثْنَیْنِ۔	پسند کرتا ہوں۔ تم ہرگز دو آدمیوں
(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب کراہۃ الامارۃ	پر بھی امیر نہ بننا۔
بغیر ضرورۃ جزء ۲ صـ۱۲)۔	

دو آدمیوں پر امیر بننے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں :۔

(۱) خلیفہ دو آدمیوں پر کسی کو امیر بنا دے۔ مثلاً امیرِ وفد۔

(۲) خلیفہ کی عدم موجودگی میں دو آدمی خود کسی کو امیر بنالیں مثلاً امیرِ جماعت یا امیرِ سفر۔

ان دو صورتوں میں سے کسی ایک کو خاص کر لینا بے دلیل ہے۔ دوسری صورت میں دو آدمیوں کے امیر کے پاس نہ کوئی حکومت ہوگی اور نہ فوج لیکن اس حالت میں بھی اس کی اطاعت فرض ہوگی۔ اگر فرض نہ ہو تو پھر وہ کونسی ذمہ داری ہے جس سے ڈرایا جا رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

عَلَیْکَ السَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ فِیْ	تم پر (امیر کا حکم) سننا اور (اس کی)
عُسْرِکَ وَیُسْرِکَ وَمَنْشَطِکَ	اطاعت کرنا لازم ہے: تنگی میں بھی
وَمَکْرَھِکَ وَاُثْرَۃٍ عَلَیْکَ	اور آسانی میں بھی، تمہاری خوشی میں
(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ	بھی اور تمہاری ناخوشی میں بھی اور
الامراء جزء ۲ صـ۱۳)	(غیر مستحق کو) تم پر ترجیح دیئے جانے

کی صورت میں بھی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صـ۱۳۱)	اگر تم پر کٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری رہنمائی کرے تو اس کی (بات کو) سنو اور اطاعت کرو۔

غلام کو امیر بنائے جانے کی دو صورتیں ہیں :۔

(۱) کوئی خلیفہ کسی غلام کو امیر بنا دے مثلاً مقامی امیر یا امیر لشکر وغیرہ۔

(۲) مشورہ سے لوگ خود کسی کو اپنا امیر بنا دیں مثلاً خلیفہ یا امیر جماعت۔

ہر دو صورتوں میں اس غلام کی اطاعت ضروری ہوگی ۔

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں :۔

اِنَّ خَلِیْلِیْ اَوْصَانِیْ اَنْ اَسْمَعَ وَاُطِیْعَ وَاِنْ کَانَ عَبْدًا مُجَدَّعَ الْاَطْرَافِ (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامراء جزء ۲ صـ۱۳۱)	میرے خلیل (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے وصیت کی کہ میں (امیر کا حکم) سنوں اور اطاعت کروں اگرچہ وہ ہاتھ پیر کٹا ہوا غلام ہی کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَۃِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَۃَ ثُمَّ مَاتَ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً (صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ عند ظہور الفتن جزء ۲ صـ۱۳۵)	جو شخص (امیر کی) اطاعت سے باہر ہو گیا اور جماعت چھوڑ دی پھر (اسی حالت میں) مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

مَنْ خَلَعَ یَدًا مِّنْ طَاعَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لَاحُجَّۃَ لَہٗ وَمَنْ مَّاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ	جس شخص نے (امیر کی) اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو وہ قیامت کے دن اللہ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت

مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً
(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الامر بلزوم الجماعۃ جزء ۲ ص۱۳۶)

نہیں ہوگی اور جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں (امیر کی) بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

ثَلَاثٌ لَا يُغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُؤْمِنٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ وَالطَّاعَةُ لِذَوِي الْأَمْرِ وَلُزُومُ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (رواہ الحاکم عن جبیر بن مطعمؓ وسندہ صحیح۔ المستدرک جزء اول ص۸۷)

تین باتیں ایسی ہیں کہ ان کے معاملہ میں مؤمن کا قلب خیانت نہیں کرتا:
(۱) عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنا۔
(۲) ذوالامر یعنی امیر کی اطاعت کرنا۔
(۳) جماعت المسلمین سے چمٹے رہنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ حَتّٰى يُرَاجِعَهٗ (رواہ الحاکم عن عبداللہ بن عمرو وسندہ صحیح ـــ المستدرک جزء اول ص۱۱۷)

جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسّی کو اپنی گردن سے اتار دیا یہاں تک کہ وہ (دوبارہ جماعت کی طرف) لوٹے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

أَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ اَللّٰهُ أَمَرَنِيْ بِهَا: اَلسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجَمَاعَةِ فَإِنَّهٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ إِلَّا أَنْ يُّرَاجِعَ۔ (رواہ الترمذی فی ابواب الامثال عن الحارث الاشعری وصححہ۔ جزء ۲ ص۲۹۶)

میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن (کی تبلیغ) کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے :-
(۱) (امیر کا حکم) سننا
(۲) اطاعت کرنا
(۳) جہاد کرنا
(۴) ہجرت کرنا ـــ اور
(۵) جماعت (سے چمٹے رہنا) کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسّی کو اپنی گردن سے علیحدہ کر دیا۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ (جماعت کی طرف) واپس لوٹے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الِاثْنَيْنِ أَبْعَدُ (رواہ الترمذی فی ابواب الفتن وصححہ جزء ۲ ص۹۶)	جماعت کو لازم پکڑو۔ علیحدگی سے بچو کیونکہ شیطان ایک آدمی کے ساتھ رہتا ہے، دو سے دور ہو جاتا ہے ۔

یہ حدیث ہر زمانہ کے لئے عام ہے ۔کوئی زمانہ اس کے لئے مخصوص نہیں ۔کیا جس زمانہ میں جماعت کے پاس حکومت نہ ہو جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے شیطان کو اپنا ساتھی بنانا جائز ہے ۔ہرگز نہیں ، لہٰذا جماعت سے علیحدگی بھی ہرگز جائز نہیں ۔جماعت سے چمٹے رہنا ضروری ہے ۔اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جماعت کے امیر سے بھی چمٹا رہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَاسْتَذَلَّ الْإِمَارَةَ لَقِيَ اللهَ وَلَا حُجَّةَ لَهُ عِنْدَ اللهِ (رواہ الحاکم وسندہ صحیح ۔المستدرک جزء اول ص۱۱۹)	جو شخص جماعت چھوڑ دے، امارت کی تذلیل کرے وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ کے نزدیک اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی (یعنی اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی جو عند اللہ مقبول ہو)

مندرجہ بالا تمام احادیث میں ـــــــــ

(۱) امیر کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے کسی حدیث میں بھی امیر کے ساتھ حکومت کی شرط نہیں لگائی گئی ۔

(۲) جماعت سے چمٹے رہنے کی تاکید کی گئی ہے ۔جماعت سے چمٹے رہنا بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ امیرِ جماعت سے چمٹا رہے اور امیرِ جماعت سے چمٹے رہنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی اطاعت کرتا رہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

أَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ فَالْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ	خبردار تم میں سے ہر شخص حکمران ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ امام جو لوگوں پر حکمران ہوتا ہے

رَعِيَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَ وَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ اَلَا فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔

(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب قول اللہ تعالیٰ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم جزء ۹ ص۷۷)

اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی! مرد اپنے اہل بیت پر حکمران ہے ۔ اس سے اس کے اہل بیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ عورت اپنے شوہر کے اہل بیت اور اس کی اولاد پر حکمران ہے اور اس سے ان کے متعلق باز پرس ہوگی ، اور غلام اپنے آقا کے مال پہ حکمران ہے اور اس سے (اس) مال کے متعلق باز پرس ہوگی (الغرض خبردار! رہو جاؤ) تم میں سے ہر ایک حکمران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس حدیث میں لفظ رَاعٍ استعمال ہوا ہے - اس کے معنیٰ درج ذیل ہیں :-

(۱) اسم فاعل وکل من ولی امر قوم، وفی الاصطلاح ھو المتحقق فی معرفۃ الامور السیاسیۃ المتعلقۃ بالمدنیۃ المتمکن علی تدبیر النظام الموجب لصلاح العالم (محیط المحیط قاموس مطول للغۃ العربیۃ ص۳۴۱)

ترجمہ (یہ لفظ رعایۃ سے) اسم فاعل (رہے، اس سے مراد) ہر وہ شخص ہے جو کسی قوم کے امر کا والی ہو اور اصطلاح میں (اس سے مراد وہ شخص ہے جو) مدنیت کے متعلق امور سیاست کو واجب اور قائم کرنے والا (ہو یا) جو صلاح عالم کے لئے انتظامی تدابیر پہ قدرت رکھنے والا (ہو)۔

(۲) کل من ولی امر قوم کالاسقف والبطریرک وغیرھما (المنجد فی اللغۃ والادب والعلوم ص۲۶۸)

ترجمہ ہر وہ شخص جو کسی قوم کے امر کا والی ہو جیسے اُسقف (بادشاہ یا عالم) اور بطریرک (سردار یا رئیس)

(۳) والی، امیر (منتھی الادب فی لغات العرب)

الغرض مندرجہ بالا تصریحات کے لحاظ سے " راعٍ " کا صحیح ترجمہ " حکمران " ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

ثَلَاثَةٌ لَا تَسْأَلُ عَنْهُمْ: رَجُلٌ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَعَصٰى إِمَامَهُ وَمَاتَ عَاصِيًا وَأَمَةٌ أَوْ عَبْدٌ أَبَقَ فَمَاتَ وَامْرَأَةٌ غَابَ زَوْجُهَا قَدْ كَفَاهَا مُؤْنَةَ الدُّنْيَا فَتَبَرَّجَتْ بَعْدَهُ فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُمْ (مسند امام احمد و مستدرک حاکم وسندہ صحیح المستدرک جزء اوّل ص۱۱۹ و حجاب المرأة المسلمة للالبانی ص۵۶)

تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کے متعلق نہ پوچھو (کہ ان کا حشر کیا ہوگا): ایک تو وہ شخص جو جماعت چھوڑ دے، اپنے امام کی نافرمانی کرے اور نافرمانی کی حالت میں مرجائے، دوسرا وہ غلام یا لونڈی جو بھاگ جائے اور (اسی حالت میں) مرجائے تیسری وہ عورت جس کا شوہر اس کے پاس موجود نہ ہو اور وہ اس کی دنیا کی ضروریات پوری کر گیا ہو۔ پھر وہ اس کے جانے کے بعد اپنا بناؤ سنگار ظاہر کرے (الغرض) ان (تینوں) کے متعلق (کچھ) نہ پوچھو (کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شر کے ایک زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

دُعَاةٌ عَلٰى أَبْوَابِ جَهَنَّمَ مَنْ أَجَابَهُمْ إِلَيْهَا قَذَفُوهُ فِيهَا

(اس زمانہ میں) دوزخ کے دروازوں پر ایسے بلانے والے ہوں گے کہ جو شخص ان کی بات کو مان لے گا وہ اسے دوزخ میں جھونک دیں گے۔

حضرت حذیفہؓ نے پوچھا:

فَمَا تَأْمُرُنِي إِنْ أَدْرَكَنِي ذٰلِكَ۔

اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں (میں کیا کروں)!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ

تم جماعت المسلمین اور ان کے امام سے چمٹے رہنا۔

(صحیح بخاری کتاب الفتن باب کیف الامر اذا لم تکن جماعة جزء ۹ ص۶۵ وصحیح مسلم کتاب الامارة باب لزوم الجماعة عند ظهور الفتن جزء ۲ ص۱۳۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس شر کے زمانے میں اسلامی حکومت نہیں ہوگی کیونکہ اسلامی حکومت کی موجودگی میں گمراہ کرنے والے داعی کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

مزید برآں اسلامی حکومت کا زمانہ تو خیر کا زمانہ ہوتا ہے نہ کہ شر کا ۔
جماعت المسلمین سے چمٹے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت میں شامل رہے ۔
امام جماعت سے چمٹے رہنے کے معنی یہ ہیں کہ امام کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔ امام سے چمٹنے کے معنی اطاعت ہی ہو سکتے ہیں اور اس کے سوا دوسرے معنی نہیں ہو سکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ اِمَامُ جَمَاعَةٍ فَاِنَّ مَوْتَهُ مَوْتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ ۔ (رواہ الحاکم وسندہ صحیح المستدرک جزء اول ص۷۱)	جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اس پر امام جماعت نہ ہو تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر مسلم کو اس حالت میں مرنا چاہیئے کہ وہ کسی امام کا ماتحت ہو۔ مندرجہ بالا تمام احادیث میں امام کی اطاعت کے لئے حکومت کی کوئی شرط نہیں ہے لہٰذا امام جیسا بھی ہو اس کی اطاعت کرنی ہوگی ۔

"امیر کی اطاعت" اور "امام جماعت ....." کی ذیل میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کے مضمون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امیر اور امام میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے بجائے استعمال ہوتے رہتے ہیں ۔

امیر کے معنی

"امیر" صفت مشبہہ ہے ۔ اس کا مصدر امارت ہے جس کے معنی ہیں : امر والا ہونا"
صفت مشبہہ میں مصدری معنی کا ثبوت اور لزوم سمجھا جاتا ہے ۔ لہٰذا امیر کے معنی میں " امر والا " ہونے کی صفت ثابت ہے اور اپنے موصوف کے ساتھ لازم یعنی چمٹی ہوئی ہے ۔ یہ صفت یعنی" امر والا " ہونا امیر سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی ۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی شخص کو امیر کہا جائے اور وہ " حکم والا " نہ ہو ۔ امیر ہر حال میں حکم والا ہو گا ۔ اس کا حکم ہر حال میں اور ہر وقت مانا جائے گا ۔ اگر کسی شخص میں " حکم والا " ہونے کی صفت ہر حال میں نہ پائی جائے تو اسے آمر تو کہہ سکتے ہیں اور وہ بھی صرف اس وقت تک جب تک وہ حکم

دینے کا فعل کر رہا ہو لیکن اسے امیر نہیں کہہ سکتے۔

امام کے معنی

امام کے معنی ہیں : مَنْ یُؤْتَمُّ بِہٖ اَیْ یُقْتَدٰی بِہٖ مِنْ رَئِیْسٍ اَوْغَیْرِہٖ (محیط المحیط ص۱۶) یعنی وہ شخص جس کی پیروی کی جائے خواہ وہ رئیس ہو یا کوئی اور۔ پیروی احکام میں بھی ہوتی ہے اور اقوال میں بھی۔ احکام کی پیروی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ	یہ (بڑی) بابرکت کتاب ہے جو ہم نے
فَاتَّبِعُوْہُ (الانعام : ۱۵۵)	نازل کی ہے۔ لہٰذا اس کی پیروی کرتے ہو

افعال کی پیروی تو عموماً کی ہی جاتی ہے اور اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

اِذَا خَرَجَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ	جب تین آدمی سفر کے لئے نکلیں تو
فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ	انہیں چاہیئے کہ اپنے میں سے ایک کو
(رواہ ابوداؤد فی کتاب الجہاد ورواتہ ثقات	امیر بنالیں۔

وسندہ صحیح وحسنہ الالبانی فی تعلیقاتہ علی المشکوٰۃ ۲/۱۱۴۵)

اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:۔

(۱) سفر میں بھی بغیر امیر کے نہ رہے۔

(۲) امیر سفر کے پاس نہ حکومت ہوتی ہے اور نہ اسے کوئی خلیفہ مقرر کرتا ہے بلکہ حدیث کی رُو سے مسافر خود کسی کو اپنا امیر مقرر کر لیتے ہیں

(۳) امیر بنانے کا مقصد سوائے اطاعت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ـــــ اور

(۴) ایسے امیر کی اطاعت بھی ضروری ہے جس کے پاس کوئی حکومت نہ ہو

نتیجہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سفر کی قلیل مدت میں بھی مسافروں کا بغیر امیر کے رہنا پسند نہیں فرماتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شہر میں مسلم آبادی کا دائمی طور پر بغیر امیر کے رہنا پسند فرمائیں گے۔ اگر سفر کی قلیل سی مدت میں امیر کا ہونا ضروری ہے تو حضر کی طویل مدت میں امیر کا ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے اور کیونکہ امیرِ سفر کی بغیر حکومت کے اطاعت ضروری ہے امیرِ جماعت کی بھی بغیر حکومت کے اطاعت ضروری ہے۔ نہ آیت میں اور نہ کسی حدیث میں امیر کی اطاعت کے لئے حکومت کی شرط لگائی گئی ہے اور نہ لگائی جا سکتی ہے۔ حکومت کی

لگانا خود ساختہ ہے لہٰذا کالعدم ہے۔
شوہر اور ماں باپ کی اطاعت بھی فرض ہے لیکن ان کی اطاعت کے لئے بھی حکومت کی شرط نہیں تو آخر امیرِ جماعت کے لئے حکومت کی شرط لگانا کس حد تک صحیح ہے۔ یقیناً یہ شرط لغو ہے۔
امیرِ سفر کی اطاعت سے صرف چند مسافروں کا مفاد وابستہ ہوتا ہے، شوہر کی اطاعت سے بیوی کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ماں باپ کی اطاعت سے صرف اولاد کا مفاد وابستہ ہوتا ہے پھر بھی یہ اطاعتیں تو فرض ہوں اور امیرِ جماعت کی اطاعت فرض نہ ہو جس سے پوری جماعت اور اللہ تعالےٰ کے دین کا مفاد وابستہ ہو۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے۔
الغرض منقول و معقول دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امیر کی اطاعت فرض ہے۔

اعتراضات اور ان کے جوابات

اعتراض ۱ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خلیفہ کو امیر یا امام کہا گیا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی امیر یا امام کا لفظ آئے گا اس سے خلیفہ ہی مراد ہوگا۔

جواب یہ تو صحیح ہے کہ خلیفہ کو بھی امیر یا امام کہا جاتا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں امیر یا امام کا لفظ آئے گا اس سے مراد خلیفہ ہی ہوگا۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے اس مفروضہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہر خلیفہ امیر یا امام ہوتا ہے لیکن ہر امیر یا امام خلیفہ نہیں ہوتا۔

اعتراض ۲ امیرِ جماعت کی اطاعت اگر فرض ہے تو وہ شرعی سزائیں کیوں نہیں نافذ کرتا۔

جواب اس اعتراض کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی طاقت کے مطابق مکلف بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا — کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ (سورہ بقرہ : ۲۸۶)

لہٰذا امیرِ جماعت اپنی طاقت کے مطابق کام کرے گا۔
دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ امیرِ جماعت خلافت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے لہٰذا اس جدوجہد کے زمانہ میں اس سے خلیفہ کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کرنا بالکل لغو ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ تیسری جماعت میں پڑھنے والا بھی طالب علم ہے اور بی اے

میں پڑھنے والا بھی طالب علم ہے۔ تیسری جماعت میں پڑھنے والا کوشش کر رہا ہے کہ وہ بھی بی، اے کا طالب علم بن جائے لیکن ابھی بنا نہیں تو کیا اس تیسری جماعت کے طالب علم سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بی، اے کے امتحان کے پرچے حل کرے۔ ہرگز نہیں۔ دونوں میں محض طالب علم ہونے کی یکسانیت اس بات کی متقاضی نہیں کہ تیسری جماعت کا طالب علم بی، اے کے پرچے حل کرے۔ بالکل اسی طرح امیرِ جماعت بھی امیر ہوتا ہے اور خلیفہ بھی امیر ہوتا ہے تو کیا امیرِ جماعت سے اس حال میں کہ وہ خلیفہ بننے کی کوشش کر رہا ہے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ خلیفہ کے فرائض سرانجام دے۔ ہرگز نہیں محض امارت کی یکسانیت اس بات کی متقاضی نہیں ہوسکتی کہ ہر امیر سے خلیفہ کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے۔

امیرِ جماعت اسوۂ رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکی زندگی میں غالب نہیں تھے۔ آپؐ کے ہاتھ میں نہ اقتدار تھا اور نہ حکومت۔ البتہ آپؐ کی حکومت مسلمین کے قلوب و ابدان پر تھی۔ جو کچھ آپؐ فرماتے تھے مسلمین اس کی اطاعت کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کے مقاصد یہ تھے:۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی تبلیغ اور اس عقیدہ کو قلوب میں راسخ کرنا،

(۲) مسلمین کی اصلاح و تربیت،

(۳) مسلمین کو نظم و ضبط اور صبر و استقامت کی تلقین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے عقیدہ کو عملی جامہ پہنانے یعنی اس عقیدہ کی بنیاد پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی منظم تحریک تھی۔

ہر تنظیم میں بعض قواعد و ضوابط پر سختی سے عمل کرایا جاتا ہے۔ تنظیم کی قوت اور قواعد و ضوابط پر عمل سربراہِ تحریک کی اطاعت پر منحصر ہے۔ اگر سربراہ کی اطاعت نہ ہوگی تو تنظیم بھی نہ ہوگی اور اگر تنظیم نہ ہوگی تو تحریک ختم ہو جائے گی۔ مکی زندگی میں بھی مسلمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرتے تھے اور حکومت الٰہیہ کی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زندگی بھی مسلمین کے لئے نمونہ اور مشعل راہ ہے۔ اسی زندگی کی اتباع کرکے مسلمین منزلِ مقصود کو پہنچ سکتے ہیں۔ حکومتِ الٰہیہ کے لئے جو تحریک چلائی جائے یا چلائی جارہی ہے

اس کے لئے اسوۂ حسنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہے۔ جس طرح مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاتی تھی اسی طرح حکومتِ الٰہیہ کو قائم کرنے کی ہر تحریک میں امیرِ تحریک کی اطاعت لازمی ہوگی۔ اگر امیر کی اطاعت نہ کی جائے تو امیر کی حیثیت ایک مٹی کے بت سے زیادہ نہیں ہوگی، مرکزیت ختم ہو جائے گی اور تحریک مردہ ہو جائے گی۔ الغرض امیرِ جماعت کی اطاعت بہت ضروری ہے اس لئے کہ اس کے بغیر حکومتِ الٰہیہ کا قیام ناممکن ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت سے کی جاتی تھی لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی تاوقتیکہ ہمارا قائد بھی نبی نہ ہو۔

جواب نبوّت ختم ہوگئی، نبی اب کوئی نہیں بن سکتا لہٰذا تنظیم کا کام اب کسی غیر نبی ہی سے لیا جاسکتا ہے اور وہ اس تنظیمی کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کو اپنا نمونہ بنائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے اسی لئے تو آپؐ کی مکی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے۔ اگر آپ نبی نہ ہوتے تو آپؐ کی مکی زندگی ہمارے لئے نمونہ نہ ہوتی۔ ہم نبوّت میں بے شک آپؐ کے شریک نہیں ہو سکتے لیکن آپؐ کے اقوال و افعال میں عموماً ہم آپؐ کے شریک ہیں یعنی ہم وہی کرتے ہیں جو آپؐ نے فرمایا اور جو آپؐ نے کیا۔ خلافت کی تحریک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جاتی ہے اسی بنیاد پر خلافت کی ہر تحریک میں امیرِ جماعت کی اطاعت لازمی طور پر کی جائے گی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مکی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بہ حیثیت نبی کے کی جاتی تھی لہٰذا وہ اطاعت اور اس اطاعت کی بنیاد پر آپؐ کی تنظیم ہمارے لئے نمونہ نہیں تو پھر بتائیے کہ کیا خلافت کی تحریک میں کسی غیر نبی کی زندگی کو نمونہ بنائیں۔ اگر نہیں تو پھر نمونہ کہاں سے لائیں۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تحریک خلافت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمارے لئے کوئی نمونہ نہیں تو کیا آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے کامل نمونہ نہیں! کیا اسلام ناقص ہے کہ اس سلسلہ میں وہ ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔

الغرض مندرجہ بالا اعتراض ایک شیطانی وسوسہ ہے، اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے

اس امر پر تو سب متفق ہیں کہ اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے اور اس کے لئے خلافت کا قیام ضروری ہے۔ اگر اعلائے کلمۃ الحق فرض ہے تو کیا اس کے لئے حتی الامکان جد و جہد فرض نہیں ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ اس کے لئے ضرور ایک تحریک چلانی ہوگی۔ ایک مضبوط جماعت بنانی ہوگی۔ اور تحریک منظم اور جماعت مضبوط اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ امیر جماعت کی اطاعت فرض ہو۔ اگر امیر جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جہاد کا حکم دے اور جماعت حکم ماننے سے یہ کہہ کر انکار کر دے کہ امیر جماعت کی اطاعت نفل ہے تو کیا جماعت اعلائے کلمۃ الحق کے فریضہ کو ادا کر سکے گی، ہرگز نہیں۔ اگر جماعت اعلائے کلمۃ الحق کو فرض سمجھتی ہے تو وہ یہ سوچے کہ پھر اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہوگا۔ کیا اس کے سوا اور بھی کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے کہ جماعت اپنے امیر کے حکم جہاد کو فرض سمجھے۔ اور فوراً جہاد کے لئے تیار ہو جائے۔ امیر کے تمام احکام اعلائے کلمۃ الحق ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ہر حکم کی اطاعت کرنی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ (النور ۔ ۵۵)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی تھی جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو جس کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے مستحکم کر دیگا۔ اور ان کے خوف و ہراس (کو ختم کرنے) کے بعد (اس کے) بدلے میں امن عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صالح مؤمنین سے تین وعدے فرمائے ہیں:۔

۱۔ ان کو حکومت و خلافت عطا فرمائے گا۔

۲۔ دینِ اسلام کو مستحکم کر دے گا۔
۳۔ خوف کی زندگی کے بدلے میں امن و امان کی زندگی دے گا۔

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان وعدوں کے پورا ہونے سے پہلے

۱۔ ان کے پاس کوئی حکومت نہ ہوگی۔
۲۔ دینِ اسلام مستحکم نہیں ہوگا۔
۳۔ ان کے دن خوف و ہراس میں گزرتے ہوں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان صالح مؤمنین کو حکومت، استحکامِ دین اور امن و امان کیسے عطا ہوگا؟ کیا اس کے لئے انہیں کچھ کرنا ہوگا یا بغیر کچھ کئے تحفتاً انہیں یہ چیزیں مل جائیں گی؟ کیا خلافت کے عطا ہونے سے پہلے مؤمنین کی کوئی جماعت ہوگی یا نہیں؟ اگر جماعت ہوگی تو کیا اس کا امیر ہوگا یا نہیں! اگر امیر ہوگا تو اس کی اطاعت لازمی ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ حصولِ خلافت کے لیئے ان صالح مؤمنین کو جماعت بھی منظم کرنی ہوگی۔ امیرِ جماعت کی اطاعت بھی کرنی ہوگی اور پھر جدوجہد بھی کرنی ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ	اللہ کے راستہ میں جہاد کرو جیسا کہ
جِهَادِهٖ ؕ (الحج : ۷۸)	جہاد کرنے کا حق ہے۔

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت موثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

ہدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کیلئے یک مشت سو نسخوں پر ۳۳ فیصد کمیشن دیا جائے گا:

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمام و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ہے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

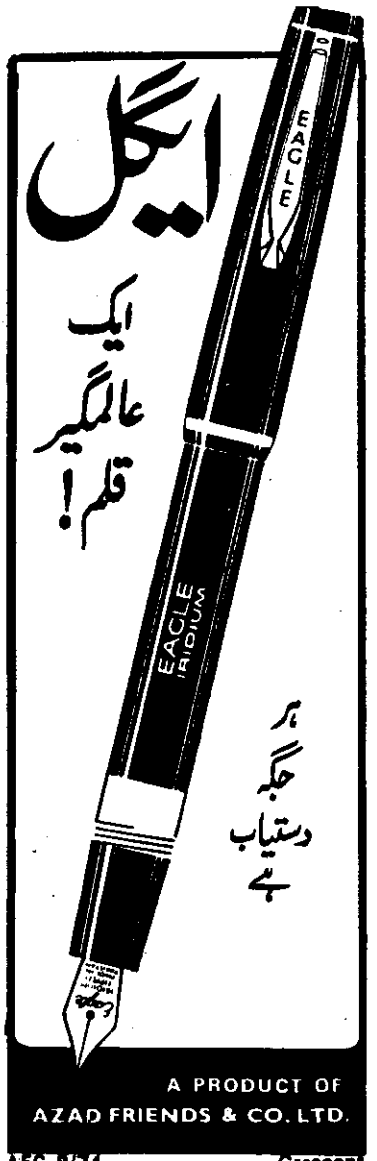

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

ماہ رجب کی آمد آمد ہے یہ وہ مہینہ ہے
جس میں

وُہ محیّر العقول واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا جسے ہم

معراج النبی

علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

کے نام سے جانتے ہیں۔ اس موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب کتابی شکل میں موجود ہے جسمیں موصوف نے اس محیّر العقل واقعہ کو قرآن مجید اور احادیث نیز عقلی استدلال سے واضح و مبرہن کیا ہے۔

انجمن اور تنظیم اسلامی
کے مکتبوں سے دستیاب ہے

افکار و آراء

اس عنوان کے تحت شائع شدہ آراء سے ادارے کا بالکلیہ متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اہلِ تشیّع اور اسلام —— نیز دیگر مسائل

جنابِ خُسروی صاحب، کراچی کا ایک مکتوب مرقومہ ۱۵ اکتوبر ۸۴ء

اس مکتوب کی تاخیر سے اشاعت پر ادارہ کو نہایت افسوس ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کو "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" والے امیرِ محترم کے خطاب کے ساتھ شائع کیا جائے چونکہ اس میں صاحبِ مکتوب کے اہلِ تشیّع کے متعلق خیالات پر امیرِ محترم کی رائے ان کے اور قارئین کرام کے سامنے آجاتی۔ لیکن چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس کی اشاعت میں تعویق و تاخیر ہوتی چلی آرہی ہے۔ لہٰذا اس مکتوب کو اس اشاعت میں شامل کیا جارہا ہے۔ سابقہ مکتوب شائع شدہ نومبر ۸۴ء میں محترم خُسروی صاحب نے مولانا مودودی مرحوم و مغفور اور جماعتِ اسلامی کے متعلق جو استفسار کیا تھا (صفحہ ۷) تو اس کا جواب موصوف کو اس شمارے میں شامل شدہ "تذکرہ و تبصرہ" میں مل جائے گا۔ (ادارہ)

محترمی، وعلیکم السلام الی یوم القیام۔ گرامی نامے ممنونِ کرم ہوئے۔

ان دونوں مکتوبات کے بعض نکات پر اظہارِ خیال کا ارادہ کر رہا تھا کہ محرم ۱۴۰۵ھ کا "میثاق" موصول ہوا جس میں مطبوعہ خطاب کے بعض پہلوؤں پر توجہ نے سبقت کی۔ چنانچہ پہلے اسی کے متعلق مکتوبہ ذیل معروضات پیش کر رہا ہوں:

سب سے پہلے تو یہ کہ میلادِ نبوی اور پاکستان کی سالگرہ ہی کو "عید" کہنے پر کیا تعجب ہے؟ یہ لفظ شرعی اصطلاحاً محلِ نظر سہی، مگر لغوی معنی سے تو جواز نکلتا ہے۔ اس سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اب "شہید" کہلانے کے لئے بھی اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جان دینے کی شرط نہیں رہی۔ "شہدائے اردو" آپ نے بھی سنا اور پڑھا ہوگا۔ جن کی قبریں یہاں لیاقت آباد میں قومی شاہراہ پر بنا کر زبردستی اس وسیع و عریض قطعۂ اراضی پر قبضہ کر لیا گیا جو ہمدرد فاؤنڈیشن کو اقامتی ہسپتال اور طبّیہ کالج اور دواسازی کے محل بنانے کے لئے

الاٹ ہوا تھا اور جس کا سنگِ بنیاد بھی مرحوم ایوب خاں نے نصب کر دیا تھا۔ جو نہ معلوم کہاں غائب کر دیا گیا۔ یہ لوگ تو پھر بھی مسلمان تھے 'یوم مئی پر سُرخوں کی تقلید میں جو تقریب سرکاری و درباری سرپرستی میں منائی جاتی ہے (جس پر دفاتر کی چھٹی قومی تعطیلات میں شامل ہے) اس کے سلسلہ میں اخبارات و جرائد کی خصوصی اشاعتوں اور ضمیموں میں اور مزدوروں کے سرمایہ دار لیڈروں کے جلسوں میں آپ نے "شہدائے شکاگو" بھی پڑھا اور سنا ہوگا (ریڈیو اور ٹی وی کے "دانش وروں" سے بھی)۔ اسی طرح فرانس اور روس کے انقلابات میں جو مارے گئے وہ بھی "شہدائے آزادی" کہے اور لکھے جاتے ہیں۔

صفحہ ۳۴ کی پہلی سطر کے حوالہ سے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کے نزدیک "کفر" کی تعریف کیا ہے؟ اگر اسلام صرف خدا کو خالق و قادر ماننے ہی کا نام ہے تو اس سے منکر تو کفارِ عرب بھی نہیں تھے۔ اگر حضورؐ کو آخری نبی اور قرآن کو آخری کتاب ماننا بھی شرطِ اسلام ہے تو پھر جو شخص زبانی تو حضورؐ کو خاتم الانبیاء کہے مگر عقیدۃً حضورؐ کے بعد بھی ایک نہ دو پورے بارہ افراد کو حضورؐ ہی کی طرح معصوم اور مفروض الاطاعۃ مانے جن میں سے ہر ایک پر وحی بھی نازل ہوتی تھی اور الگ الگ صحیفہ بھی نازل ہوا تھا اور جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر سکتے ہیں، جس کا اختیار حضورؐ کو بھی نہیں تھا' اسے آپ کیا کہیں گے۔ اور پھر جو تمام جامعین و حافظین و ناشرینِ قرآن کو منافق و مرتد سمجھے اور اس بین الدفتین کتاب کو ان ہی لوگوں کی من گھڑت ہونے اور اصل قرآن کے ہنوز مستور رہونے پر یقین رکھے' اسے آپ کیا سمجھیں گے؟ ایسا شخص تو دراصل "اہلِ کتاب" نہیں ہے کیونکہ وہ کتابِ مشہود کو مانتا نہیں اور اس کی معتقد علیہ کتاب مستور اس کے پاس ہے نہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس، جعلی ہی سہی، کتابیں موجود تو ہیں۔

یہ تو صورت ان کے ایمان کی ہے۔ اب اسلام کو دیکھئے تو کلمۂ شہادت' اذان، وضو، نماز، روزہ اور دیگر تمام شعائرِ اسلام میں سے کس بات میں ان کا جمہور اہلِ اسلام سے اشتراک ہے؟ وجہ یہ کہ ہم میں اور ان میں قدرِ مشترک وہ کتاب ہے نہ سنّت۔ کتاب کے متعلق تو عرض کر چکا ہوں اور سنّت کا حال یہ کہ ان کی روایات کا سلسلہ حضرت باقر و جعفر یا ان کے اخلاف و احفاد (علیہم الرحمۃ) سے اوپر پہنچتا ہی نہیں اور پھر یہ کہ راویوں کے بیشتر سلاسل میں راویٔ اوّل زرارہ جیسا شخص ہے جسے خود ان کے علمائے رجال نے کذّاب کہا ہے۔ ان کی امہات کتب کی رو سے جو ان کا اہم عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں لہٰذا منطقی نتیجہ یہ کہ یا تو وہ مسلمان نہیں یا ہم نہیں۔ یہ تو ہمارے علماء کا جہل یا تقیہ کہ رفض کو محض ایک مکتبِ فکر ہی کہے جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے جب عالمِ کشف میں حضورؐ سے ان کے متعلق استفسار کیا تھا اور اس کا جو جواب ملا تھا کیا وہ آپ کے علم میں نہیں؟ چلئے آپ مکاشفات کو شرعاً معتبر نہ سمجھیں مگر مرقومہ بالا واقعاتی اور دستاویزی شہادتوں کو کیسے نظر انداز

کر سکیں گے ؟ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ آپ ان اساسی اختلافات کو نہیں جانتے اور نہ یہ ماننے کو جی چاہتا ہے کہ آپ منافقانہ ان کو دائرہ اسلام ہی کی ایک قوس کہتے ہیں، کیونکہ نفاق اہل سنّت کا شیوہ نہیں۔ تو پھر یہ کہنا کہ " سنّی شیعہ اختلاف سب کے نزدیک کفر اور اسلام کا اختلاف تو ہے نہیں[1] " چہ معنی دارد ؟ مقابلتاً قادیانی ان سے بہتر ہیں کہ نہ وہ کوئی دوسرا قرآن مانتے ہیں نہ صحابہؓ کو منافق و مرتد کہتے ہیں، نہ نماز و روزہ الگ ہے، نہ احادیث کا مجموعہ جُدا ہے، نہ فقہ مختلف ہے۔ اختلاف صرف عقیدۂ ختم نبوّت پر ہے (جس کی بناء پر ہی ان کا غیر مسلم ہونا عقلاً و شرعاً ثابت ہے) لیکن ان کے ہاں تو ختم نبوّت سے عقیدۃً انکار بھی ہے (جس کا تقیۃً اعلان نہیں کرتے) اور اس کے سوا اور بھی سارے اختلافات ایمانی و اسلامی۔ تو کیا یہ قادیانیوں سے زیادہ تکفیر کے مستحق نہیں ہیں!

مرکزی اور صوبائی سول اور دفاعی محکموں میں ہی نہیں تمام نیم سرکاری خود مختار اداروں میں بھی تمام با اختیار مناصب پر ۵۰ نہیں تو ۴۰ فیصد تو یقیناً یہی قابض ہیں۔ اگر صرف چھ مہینے کے لئے کسی معتبر و مستعد شخص کو صرف اس کام پر مامور کر دیں کہ اخبارات و رسائل میں اور ریڈیو اور ٹی وی پر کسی بھی سلسلہ میں جو نام درج اور نشر ہوتے ہیں وہ نوٹ کرتا رہے تو آپ کو ناموں سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ انتظامیہ کے (سرکاری و نیم سرکاری اداروں) میں ان کا تناسب کیا ہے ؟ اور کن کن اونچی کرسیوں پر یہ لوگ براجمان ہیں۔ دفاعی محکموں سے یہ معلومات مجوّزہ بالا ذرائع سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ لہٰذا اس کے لئے کوئی اور تدبیر کرنی پڑے گی جو آپ کے وسیع حلقۂ رفقاء کی وجہ سے مشکل نہیں ہوگی۔

ان کے مقابلہ میں حکومت کی بے بسی کا اندازہ آپ کو زکوٰۃ و عشر کے معاملہ میں انکے اسلام آباد میں مظاہرہ سے بھی ہو جانا چاہئے کہ اور سال گزشتہ یہاں نئی کراچی کے فساد کے سلسلہ میں (باوجود دفعہ ۱۴۴) تقریباً ۳۶ گھنٹے ان کے ہزاروں آدمیوں کے بندر روڈ کو بلاک رکھنے سے بھی، نیز اس محرم پر یہاں جو کچھ ہوا اور ہنوز ہو رہا ہے، اس سے بھی حالیہ واقعات کے اسباب پر تحقیقات کے لئے ہائی کورٹ کے ایک جج کی سربراہی میں کمیٹی بنائی گئی ہے، اگر اس نے کوئی رپورٹ جناب صدر کو پیش کی بھی تو شاید ہی منظرِ عام پر آئے ـــــ جیسے نئی کراچی کے فساد کے سلسلہ میں جو رپورٹ تیار ہوئی تھی وہ دبا دی گئی، کیونکہ اس میں دونوں فریقوں کی ہی زیادتیوں کا ذکر تھا۔ ان مسلسل مشاہدات کے بعد بھی آپ جناب صدر سے یہ توقع کیوں رکھتے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں آپ جیسوں کی مانیں گے جو کسی

---

[1] جملہ کا انداز خود بول رہا ہے کہ اس میں عوام الناس کی اکثریت کی رائے کی طرف اشارہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی دور میں بھی اہل تشیّع کی اجتماعی و قانونی طور پر اس طرح تا حال تکفیر نہیں ہوئی ہے جیسے قادیانیوں کے معاملہ میں ہوئی ہے۔ (مرتب)

طرح، کسی قسم کی طاقت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے! کارِ کلیمی ہو یا کارِ فرعونی، بغیر عصا کے ہر ایک بے بنیاد ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ فقہ جعفری واقعی نافذ ہو ہی جائے تو مغرب زدہ نژادِ نو بھی "مومن" ہو جائے کیونکہ اس فقہ میں تو علاوہ متعہ کے، محرمات کے معاملہ میں "لفِ حریر" جیسی عیاشانہ رخصتیں بھی شامل ہیں اور بعض معمولی سی شرائط کے ساتھ "صحبت ہم جنس" بھی۔ حکومت کی مجبوری کی وجہ علاوہ مذکورہ بالا داخلی کے خارجی دباؤ بھی ہے کہ دو دشمن تو دائیں بائیں پہلے ہی شمشیر بکف گھات میں ہیں۔ ایک اور پڑوسی کو بھی دشمن بنالینا مزید خطرناک ہے اور پڑوسی بھی وہ ملک جہاں، حسن بن صباح کے فدائیوں کے پیروز، مذہبی جنونی برسرِاقتدار ہیں۔ اگر کسی طرح آپ تہران سے خمینی کی اب تک کی تقاریر کے کتابی صورت میں مطبوعہ مجموعے منگوا سکیں تو دیکھئے گا کہ ہر موقعہ اور تقریب پر جو تقریریں ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہوئی ہیں ان میں مسلمانانِ عالم اور عالم عرب کے لئے جو کچھ کہا ہے وہ کہا ہی ہے لیکن بالخصوص پاکستان کے متعلق کن عزائم کا اظہار ہوتا رہا ہے اور کیا کیا دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ نئی کراچی کے فسادات میں تو کھلم کھلا ایرانی قونصلر ملوث تھا۔ جس پر حکومت نے احتجاج کر کے اسے نکلوایا۔ لیکن سفارت خانے سے جو بڑی بڑی رقومات مستقلاً اور مسلسل ان کے اداروں کو ملتی ہیں اور جو ان کے علماء زیارات کے بہانے وہاں جاکر لاتے ہیں ان کا حساب کون لگا سکتا ہے! نئی کراچی میں اور اس کے بعد جو اسلحہ جات برآمد ہوئے وہ آخر کہاں سے آتے ہیں اور کس کے خلاف استعمال کے لئے!

نہ معلوم آپ کو یہ شکایت کیوں ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے پہلے ایتاءِ زکوٰۃ کے لئے ہی کیوں مجبور کیا گیا! صلوٰۃ سے سرکاری خزانہ میں کیا آجاتا؟ اور اب تو زکوٰۃ کی طرح صلوٰۃ کے لئے کوئی قانونی جبر نہیں ہے، لہٰذا نتیجہ معلوم! اور یہ شکوہ بھی غلط کہ زکوٰۃ صرف بنکوں میں جمع کردہ رقوم پر کیوں ہے! مالِ تجارت پر کیوں نہیں! سرمایہ دار تاجروں اور صنعتکاروں کا جو دباؤ ہمیشہ سے انتظامیہ اور مقننہ پر رہا ہے اور رہے گا اس سے تجاہلِ عارفانہ کیوں؟ بنکوں کے ذریعے سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے اس سے بھی تو آخر یہ لوگ مستثنیٰ ہی ہیں۔ ان لوگوں میں سے کوئی صرف سات آٹھ فیصد سالانہ منافع کے لئے سیونگ اکاؤنٹس میں رقم جمع کیوں کرے جبکہ اس سے دس گنا نفع تو سال بھر میں وہی رقم صنعت یا تجارت میں لگا کر آسانی سے حاصل کر سکتا ہے! لہٰذا ان اصحابِ دُوَل کی رقومات ہمیشہ کرنٹ اکاؤنٹس میں رہتی ہیں، جن سے زکوٰۃ قانوناً کٹتی ہی نہیں چاہے کسی کھاتے میں لاکھوں روپیہ بھی ہوں۔ اس کے برعکس عام آدمی اگر پیٹ کاٹ کر کسی آڑے وقت کے لئے تین ہزار روپیہ سیونگس اکاؤنٹس میں تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرا دے تو ۷۵ روپیہ زکوٰۃ کٹ جاتی ہے۔ ایک اور عجوبہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ سودی یا نام نہاد بلاسودی بچت کھاتوں میں تو تین ہزار روپیہ پر یہ کٹوتی ہوتی ہے لیکن نام نہاد بلاسودی میعادی کھاتے (ٹرم ڈپازٹ) میں اگر ایک ہزار بھی ہوں تو ۲۵ روپے وضع ہو جاتے ہیں۔

گویا کہ :—

(۱) کرنٹ اکاؤنٹس میں تو اگر کروڑوں ہوں تب بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں ۔

(۲) سودی یا نام نہاد بلاسودی بچت کھاتے میں تین ہزار (یا ہر سال جو بھی نصاب مقرر ہو اس) پہ زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور

(۳) نام نہاد بلاسودی میعادی کھاتے میں اگر ایک ہزار بھی ہوں (جس سے کم رقم سے یہ کھاتہ کھولا ہی نہیں جاسکتا) تو اس پہ بھی زکوٰۃ دینی پڑتی ہے ۔ یہ ایک ہزار پہ زکوٰۃ کی کٹوتی صرف نام نہاد بلاسودی کھاتے سے نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی کی صرف ایک ہزار کی رقم آئی سی پی کے شراکتی کھاتے (میوچل فنڈ) کے ذریعہ بھی تجارت میں لگی ہو تو اس پہ بھی زکوٰۃ کٹ جاتی ہے ۔ گویا کہ یہ فرض کر لیا گیا کہ جس کے ایک ہزار آئی سی پی کے شراکتی کھاتے یا بنک کے میعادی کھاتے میں ہیں اس کے پاس لازمی طور پہ دو ہزار اور بھی ہوں گے ۔ لہٰذا **صاحبِ نصاب ہے**

چنانچہ اکتوبر میں آئی سی پی نے جو سالانہ منافع برائے سال مختتمہ ۳۰ ر ۶ ر ۸۴ تقسیم کیا اس میں سے بلالحاظ مقدار اصل رقم ، زکوٰۃ کاٹ لی ۔ زکوٰۃ کے معاملے میں " شُد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا " والی بات بھی ہے ۔ کیونکہ یا تو محکمۂ زکوٰۃ سے واضح ہدایات جاری نہیں ہوئیں یا بنکنگ کونسل نے پانچوں بنکوں کو تصریحاً نہیں بتایا ۔ چنانچہ سودی اور نام نہاد بلاسودی کھاتوں سے تو زکوٰۃ سب ہی بنک وضع کر رہے ہیں لیکن میعادی کھاتوں سے زکوٰۃ کی وصولی میں اختلافِ عملی ہے ۔ کچھ بنک تو منافع میں سے وصول کر لیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے کہ جب بعد انقضائے میعاد اصل رقم واپس کی جائے گی اس میں سے اکٹھی تمام سالوں کی مجموعی زکوٰۃ وصول کی جائے گی ، جیسا کہ مختلف نوعیت کے میعادی سیونگ سرٹیفکیٹس پہ اصل رقم بعد اختتام میعاد واپس کرتے ہوئے وصول کی جاتی ہے ۔ سوال یہ نہیں کہ ہر سال منافع میں سے زکوٰۃ کاٹنی درست ہے یا میعاد پوری ہونے پہ تمام سالوں کی اکٹھی وصول کرنا ؟ سوال یہ ہے کہ بنکوں کے طریقۂ کار میں یہ اختلاف اور دو عملی کیوں ہے اور کس کی وجہ سے ہے ؟ ایک یہ اس سے بھی بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ اس سال زکوٰۃ یکم جون ۱۹۸۴ء : یکم رمضان ۱۴۰۴ھ کو واجب الوصول ہوئی اور منافع ۳۰ر جون ۸۴ء کو بنکوں کی طرف سے واجب الادا ہوا یعنی کہ منافع سے جو کھاتہ داروں کو آمدنی ہوئی وہ اگلے زکوٰتی سال ۱۴۰۵ھ میں جس کی زکوٰۃ یکم رمضان ۱۴۰۵ھ کو واجب الادا ہوگی اس میں محسوب ہونی چاہیئے لیکن منافعہ کی یہ آمدنی جو اس سال ہوئی وہ سابقہ سال کی بچت محسوب کر کے اس پہ بھی زکوٰۃ کاٹ لی یعنی یکم رمضان ۱۴۰۴ھ کو کھاتہ میں وہ منافعہ کی رقم تھی ہی نہیں مگر سمجھا یہ گیا کہ کیونکہ اصل رقم تھی لہٰذا آئندہ ملنے والا منافعہ بھی اس میں شامل تھا ۔ ایسے " اسلامی لطیفے " پاکستان ہی میں نفاذِ اسلام سے وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ۔ اور ہاں اس میں بھی یہی ہوا کہ کچھ بنکوں نے اس منافعہ پہ بھی زکوٰۃ کاٹی اور کچھ نے نہیں کاٹی اور جائز مؤقف اختیار کیا کہ کیونکہ یہ رقم وضع زکوٰۃ کے بعد کھاتہ

میں آئی ہے۔ لہٰذا اس پر کٹوتی نہیں ہوگی بلکہ صرف اسی رقم پر جو اس تاریخ کو کھاتہ میں تھی۔

اس اندھے کی لاٹھی گھمانے میں اور بھی عجیب عجیب طرفگیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی نے بغرض حفاظت اپنی رقم آپ کو امانت دی ہے اور آپ نے اسے اپنے بنک کے بچت کھاتے میں جمع کر دیا تو اس پہ بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ پچھلے سال کا ایک واقعہ مجھے ایک بنک کے افسر ہی نے سنایا کہ اس بنک کے پٹھان چوکیدار کے دوست نے اپنی پرانی ٹیکسی ستر ہزار میں بیچ دی اور نئی خریدنے کے لئے بات چیت کسی کمپنی یا کسی پرائیویٹ مالک سے شروع کر دی۔ دریں اثنا اس نے وہ پوری رقم اپنے دوست چوکیدار کو بطور امانت محفوظ رکھنے کو دے دی اور اس غریب نے اپنی بنک میں جہاں ملازم تھا اپنے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کر دی۔ دوسرے دن یکم رمضان کو جو زکوٰۃ وصول کی گئی تو اس کے کھاتہ میں ان ستر ہزار سے اکہزار سات سو پچاس روپیہ کاٹ لئے۔ دو چار دن بعد جب اس ٹیکسی والے نے نئی ٹیکسی کے لئے سودا طے کر کے ادائیگی کے لئے اپنے چوکیدار دوست سے رقم واپس مانگی اور اس نے روپیہ نکالنے کے لئے چیک پیش کیا تو یہ پتہ لگا۔ نتیجہ یہ کہ چوکیدار کا بنک سے اور اس ٹیکسی والے کا چوکیدار سے بہت جھگڑا ہوا اور آخر کار غریب چوکیدار کو وہ رقم بھگتنی پڑی۔ اس سے بڑا گھپلا یہ کہ اگر کوئی مقروض ادائے قرض کے لئے تھوڑی تھوڑی رقومات بنک میں جمع کراتا رہا ہے کہ مطلوبہ رقم اکٹھی ہونے پر نکال کر قرض اتار دونگا۔ تو وہ رقم وضع زکوٰۃ کی وجہ سے ہر سال کم ہوتی جائے گی۔ اور تو اور، کسی بنک سے بھی رقم قرض لی ہوئی اور اسی بنک کے بچت کھاتے میں سرکاری اعلان کردہ نصاب کے برابر یا زیادہ رقم پڑی ہوئی ہے تو بلالحاظ اس مقروضہ رقم سے جو اسے اسی بنک کو ادا کرنی ہے اس کھاتے میں سے زکوٰۃ کٹ جائے گی۔

حالانکہ شرعاً قرض کی واجب الادا رقم سے زائد اگر رقم ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ادائے قرض اور ادائے زکوٰۃ کے دو فرائض میں سے ترجیح اوّل الذکر فرض کو ہے۔ یہی صورت تعمیر مکانات کے لئے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے لئے ہوئے قرض کی بھی ہے۔ اگر کسی پر اس سلسلہ میں ایک لاکھ قرض ہے اور بنک میں صرف نصاب کے مطابق رقم ہے تو اس واجب الادا قرض کی رقم کو نظر انداز کر کے کھاتے میں سے کٹوتی کر دی جائے گی۔ یہ تو سرکاری اداروں سے قرض لی ہوئی رقومات کی صورت ہے جس کا دفتری ثبوت بھی ہوتا ہے۔ اگر نجی طور پر کسی سے بغیر دستاویز یا دستاویز پر قرض لیا ہوا ہے تو اسے بھی وضع زکوٰۃ کے لئے کوئی نہیں مانتا۔ یعنی بات یہ ہوئی کہ سرکاری خزانہ میں تو رقم آنی چاہئے، تم پر کسی کا قرض ہے تو مکان بیچو اور نہ ہو تو بیوی بچوں کو رہن رکھ کر ادا کرو، ہمیں کیا غرض۔ اس سلسلہ میں جتنا کچھ عرض کیا ہے وہ سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ سب میرا ذاتی تجربہ ہے۔ لیکن یہ بلائے زکوٰۃ تو عوام کالانعام پر ہی نازل ہوئی ہے۔ سرمایہ دار تاجر و صنعت کار، جن کے ایک ہاتھ میں انتظامیہ کی لگام اور دوسرے میں قانون ساز اداروں کی نکیل ہمیشہ سے رہی ہے ان کے لئے کھلی چھوٹ ہے کہ ان کے اموالِ تجارت پر زکوٰۃ

ہے، نہ کرنٹ اکاؤنٹس میں جمع شدہ "اموال ظاہرہ" پر چاہے لاکھوں کروڑوں روپیہ ہوں۔

یہ تو حال ہے قانونِ زکوٰۃ کے نفاذ کا۔ اب جو قانونِ عُشر آیا ہے اس کا بھی حال سن لیجئے کہ اس "رشوتستان" میں اس سے فائدہ نہ عوام مستحقین کو ہوگا نہ حکومت کو۔ چھوٹے موٹے کاشت کاروں پر تو یہ عائد ہی نہیں ہوتا۔ اور بڑے بڑے وڈیروں، زمینداروں اور مربع داروں کے اقتدار سے باہر مقامی محصلینِ عُشر ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بَیر رکھنے میں جان و آبرو کا ہر وقت خطرہ ہے۔ پھر علاوہ "زور" کے "زر" بھی تو انہیں کے پاس ہے۔ عُشر کا تخمینہ لگانے والے "بزور" یا "بزر" چاہیں تو گیہوں کو باجرا لکھدیں، چاہیں تو دس من پیداوار کو پانچ من درج کر دیں اور چاہیں تو لہلہاتی فصل والی زمین کو بنجر اور کلر لکھدیں۔ اوپر والوں میں سے چیک کرنے کو کون آتا ہے۔ اور کس کس اندراج کو چیک کرتا پھرے گا! اور اگر آیا بھی تو وہ بھی کون سا فرشتہ ہوگا! ہاں یہ ہے کہ اس کا پیٹ بڑا ہوگا تو ان لوگوں کو بڑے سے بڑا پیٹ بھرنے کی بھی استطاعت ہے اور اسمیں بھی فائدہ ہی ہے کہ بجائے ایک ہزار عُشر ادا کرنے کے دہنِ سگ پانچ سو سے ہی دوختہ ہو جاتا ہے تو نقصان کیا ہے؟

غرض یہ کہ اسلام کے نام پر جن مصنوعات کی نمائش لگائی جارہی ہے وہ اسی اسلام کی ہیں جس کے مبلغ ہونے کا خطاب طارق عزیز کو عطا ہوا ہے۔ اس اسلام کے تو ارکانِ خمسہ رقص، موسیقی و اداکاری و آزادیٔ نسوانیت اور تشہیرِ جسم و جنس ہی ہو سکتے ہیں تو پھر آرٹ اور کلچر کے ان مظاہر، یعنی فلموں اور ٹی وی کے اداکاروں اور صداکاروں کی پرورش اور حوصلہ افزائی تو اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ جن کی ادائیگی نہ ہو تو دنیا پر کیسے ثابت کیا جائیگا کہ جس مقصد کے لئے یہ خطۂ زمین خدا نے دے دیا تھا وہ ہم پورا کر رہے ہیں!۔

اور شریعت کورٹس کے دائرۂ اختیار سے عائلی قوانین کا جائزہ الگ رکھنے کی وجہ کیوں ناقابلِ فہم ہے؟ یہ قانون جب ایک مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے نافذ کیا تھا تو پیشہ کی ہم آہنگی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ دوسرا بھی اسے محترم سمجھتا رہے۔ "اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاءَنَا" کا اصول بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ اور اصل بات یہ کہ آزادیٔ نسوان اور مساواتِ مرد و زن کے معاملہ میں حقیقی دباؤ معدودے چند لولیانِ اطلس پوش کا نہیں ہے جبکہ صرف اسٹیج پر کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور مشرقی و مغربی ہمسایوں کے ہاتھوں میں ہے جو مر رہا نہ یہاں مسلسل فکری اور نتیجۃً عملی انتشار چاہتے ہیں اور جن کے تنخواہ دار گرگے یہاں نام نہاد ترقی پسند ادیبوں اور ابلاغِ عامہ کے سرکاری اور درباری اداروں اور آرٹ اور کلچر کے مراکز میں معتدرینِ اعلیٰ ہیں اور لاکھوں روپیہ خزانۂ عامرہ سے ان پر خرچ ہوتے ہیں۔

جناب صدر نے جو فلموں سے آمدنی کو رزقِ حلال کہا ہے؟ اس میں کیا حرج ہے! اسلامی اقدار و شعائر کے گوسفندوں کو حلال کر کے منڈی میں فروخت کرنے سے جو رزق حاصل ہو وہ حلال نہیں تو کیا حرام ہوگا! یا شاید پھر طنزاً فلم والوں کو "حلال خور" کہا ہو، یہ تو وہی جانیں کہ کیا منشاء تھا! جناب صدر کی اسلام آوری کے بیانات سے جو بابرہ شریف جیسی فلمی عشوہ فروشوں کو غلط فہمی ہوگئی تھی اس کا ازالہ کر کے انہوں نے علماء کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش اپنی طرف سے تو کر دی۔ اب یہ محترم حضرات جنت الحمقاء میں ہی رہنے پر مصر ہوں تو اس میں صدر صاحب پر تو الزام آتا نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ہر طرف سے یلغار کرتا ہوا اسلام آ رہا ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے

ابھی تو بس اونٹ کی گردن ہی جھونپڑی میں داخل ہوئی ہے۔ جب پورا اونٹ گھس آئے گا تب کیا معلوم سما بھی سکے گا یا جھونپڑی تو رہے گی نہیں بس اونٹ ہی بلبلاتا نظر آئے گا۔ وہ جو ایک بزرگ کا مشہور شعر ہے (جو بطور ٹوٹکے کے عسرِ ولادت کی صورت میں لکھ کر حاملہ کے پیٹ پہ باندھ دیا جاتا ہے) وہ اس وقت یاد آ رہا ہے کہ ؎

مرا جا شد، خرم را نیز جا شد زنِ دہقان نزاید یا نہ زاید

یعنی شترِ اسلام داخل ہو جائے چاہے جھونپڑی رہے یا نہ رہے۔ اس اسلام پر شتریت کا اطلاق یوں ہوتا ہے کہ ابھی تک کوئی کل سیدھی نظر نہیں آئی

سندھ میں جو کچھ لاوا پک رہا ہے اس کے حال کا تصور ہی بڑا ہولناک ہے۔ جی ایم سید کو نظر بند رکھنا لاحاصل ہے کیونکہ اسکی پوری اُمت بالائی اور زیرین سندھ کے ہر علاقہ میں فعال ہے اور ہر جگہ ہر معاشی معاشرتی، نجی، سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں میں با اثر ہے۔ شیخ ایاز، حمیدہ کھوڑو، شمشیر الحیدری اور غلام مصطفیٰ تو گنتی کے چند نمایاں کمعار ہیں، ورنہ تو نہ جانیں کتنے کہاں کہاں بنیاد کھود رہے ہیں اور مسلح و غیر مسلح تخریب کاری کے لئے کیا کیا اسلحہ اور مالی امداد اپنے مشرقی اور مغربی سرپرستوں سے کیسے کیسے حاصل کر رہے ہیں! غلام مصطفیٰ شاہ کا جو انگریزی جریدہ شائع ہوتا ہے اس میں اسلام اور اقبال اور قائداعظم اور دیگر بانیانِ پاکستان کے لئے جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بھارت کے جرائد بھی نہیں لکھتے۔ نظریۂ پاکستان کی جیسی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں اور اسلامی افکار کے جس طرح پرخچے اڑائے جاتے ہیں وہ آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے، بشرطیکہ کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھے لیکن کیونکہ صوبائی انتظامیہ میں اکثریت انہیں لوگوں کی ہے، جن میں سابق حکومت کے شکست خوردہ اور آمادۂ انتقام افراد بھی شامل ہوگئے ہیں، لہٰذا اوپر رپورٹیں "سب ٹھیک ہے" ہی کی بھیج سکتے ہیں۔ اور جناب صدر کے دوروں میں بھی اپنے ہی لوگوں سے زندہ باد کے نعرے لگوا کر امن و امان کے تاثر

کو مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ یہ بھانڈا تو انتخابات ہی میں پھوٹے گا اور اگر اس وقت سختی کی گئی، جس کے نتیجے میں انہیں میں سے دو چار ہزار بھی مشرقی سرحد پار کر کے بظاہر پناہ لینے کے لئے نکل گئے تو پھر ان کے سرپرست کو وہی بہانہ مل جائے گا جو ۱۹۷۱ء میں مل گیا تھا، جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش بن گیا۔ اگر اسی طرح سندھو دیش بھی بنا تو وڈھائی کروڑ پناہ گیر تو خیر مارے ہی جائیں گے، لیکن یہ "بڑے بھائی" جو یہاں مرکزی حکومت کے سرکاری و نیم سرکاری محکموں، نیز صنعتی و تجارتی شعبوں میں اس صوبہ کو اپنی کالونی سمجھ کر راج کر رہے ہیں، ان کا حال اور بھی بُرا ہوگا کیونکہ سندھیوں کو پنجابیوں سے ویسی ہی نفرت ہے جیسے ہندوستان کے عوام کو بدیسی حکمرانوں سے تھی اور وجوہات بھی وہی ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں بلکہ سندھی میں ایک پرانی ضرب المثل ہے کہ اگر سانپ اور پنجابی ساتھ نظر آجائیں تو پہلے پنجابی کو مارو پھر سانپ کو۔ رہے ہم پناہ گیر جن کا سب سے بڑا مرکز کراچی اور پھر حیدر آباد ہے تو سرکاری ملازمتوں میں اوّل تو کوٹا سسٹم نے راستہ بند کر دیا ہے، جس کے خلاف احتجاجات پر جناب صدر نے اعلان کر دیا کہ یہ پرنالہ تو وہیں گرتا رہے گا جہاں مدّت سے گر رہا ہے۔ پھر یہ کہ سرکاری آسامیوں کے اشتہارات میں کھلم کھلا مہاجروں کے دونوں شہروں کے باشندوں کو اہل بیت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اگر بظاہر یہ استثناء نہ بھی ہو تو صوبائی محکموں میں تو ۹۹٪ وہی تقرر کا اختیار رکھتے ہیں جو سندھو دیش کے حامی ہیں اور مرکزی یا مرکز کے تحت محکموں میں پنجاب کے لوگ ہیں جو اپنے ہم صوبہ لوگوں کے علاوہ کسی اور کو دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ پھر بھی انتخابات میں اگر سندھ سے جناب صدر کوئی توقع رکھ سکتے ہیں تو ہم پناہ گیروں سے ہی کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر غلبہ پنجاب کا رہا تو پھر بھی سندھیوں کے مقابلہ میں شاید ہم پر توجہ کر سکیں۔ ورنہ اگر سندھو دیش کے حامیوں کو ہی انتخابات میں کامیابی ہوئی تو وہی حال ہوگا جو بھٹو کے اقتدار کے آخری دن ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس لئے ہمیں بھی عافیت اسی میں نظر آتی ہے بقول آپ کے "اھون البلیتین" ہی رہے گا۔ مگر اب مشکل یہ ہو گئی ہے کہ بیرونی اور اندرونی سیاسی دباؤ اور بین الاقوامی، خصوصاً دونوں طرف کی سرحدوں کے حالات کے پیش نظر انتخابات سانپ کے سونہہ کی چھچھوندر ہو گئے ہیں۔ اسلام وسلام کی بات تو بعد کو سوچئے، پہلے اس خطّہ کی خیر منائیے۔ جہاں سچ مچ کے اسلام کے کبھی نہ کبھی نافذ ہونے کی امید تو ہے، چاہے اگلی صدی میں ہی پوری ہو۔ اب یہ ملک ۱۹۶۵ء والا نہیں ہے۔ جب جرائم پیشہ تک اس کی حفاظت کے لئے سر بکف نکل آئے تھے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک صرف ۵ برس میں افکار و احوال میں جو تبدیلی آئی اس کا ثبوت تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔ اب ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۴ء تو چودہ برس ہو چکے جو عرصہ بھی طویل تر ہے اور وقت کی رفتار بھی تیز تر رہی ہے اور سمت میں بھی زیادہ کجی آگئی ہے تو اب اندازہ کیجئے کہ نتیجہ کیا رہے گا! معاذ اللہ۔

لاہور اور گرد و نواح کے قارئین "میثاق" سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز

شامِ الہُدیٰ - لاہور

کی تیسری نشست بتاریخ ۸ مارچ ۸۵ء بروز جمعۃ المبارک
بوقت سات بجے بعد نماز مغرب

بمقام: واپڈا آڈیٹوریم - واپڈا ہاؤس

منعقد ہوگی جس میں سورہ حج کے آخری رکوع کا درس ہوگا۔
مزید براں چوتھی نشست کا اسی مقام پر انعقاد ان شاء اللہ العزیز
۵ اپریل ۸۵ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب ہوگا جس میں سورہ صف
مکمل زیر درس رہے گی۔

کراچی اور گرد و نواح کے قارئین "میثاق" سے التماس ہے کہ
وہ نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز

شامِ الہُدیٰ - کراچی

کی آئندہ نشست ۱۸ مارچ ۸۵ بروز سوموار (پیر)
بوقت پونے آٹھ بجے (۷:۴۵) بعد نماز مغرب

بمقام: تاج محل ہوٹل موتی محل آڈیٹوریم - شارع فیصل

منعقد ہوگی جس میں سورہ المنفقون مکمل کا درس ہوگا۔

فریش ویل
سوئیٹس
صدیوں پرانی روایات کی حامل ہماری مٹھائیاں اور حلوہ جات یقیناً ہمارے ذائقے اور لذت کی غمازی کرتی ہیں۔ احمد نے اس قدیم پیشے کو جدید دور کے تقاضوں سے ہمکنار کیا اور اپنی مصنوعات کو بالکل منفرد انداز میں پیش کیا۔
پاکستانی تہذیب کا آئینہ دار
دنیا کے ہر برّاعظم میں احمد کی مٹھائیاں اور حلوہ جات پاکستانی تہذیب اور روایات کی شناخت ہیں۔
Freshwel
Freshwel
حلوہ جوزی
Freshwel
Freshwel
جدید ترین نائٹروجن پیکنگ پلانٹ پر سیلوفین پیکنگ کے ساتھ پیک کئے جاتے ہیں تاکہ تازگی اور خستگی ہمہ وقت برقرار رہے
ٹین کے لیڈ بغیر مشین کے آسانی سے کھل جاتے ہیں۔
سوہن حلوہ
کراچی حلوہ
حبشی حلوہ
حلوہ جوزی
رس گلے
زعفرانی جامن
سوہن ڈیلائیٹ
تلے ہوئے مصالحہ دار بادام
مٹھائیوں میں روایتی اور صنعتی معیار کے خالق
AHMED
احمد کراچی حلوہ مرچنٹ لمیٹڈ
ڈی-۱۱۲، سائیٹ، کراچی۔ فون: ۲۹۴۲۹۱-۹۵

الہدیٰ

کیسٹ سیریز

ڈاکٹر اسرار احمد (امیر تنظیم اسلامی)
کے مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل

درسِ قرآن

کے ۳۰ کیسٹس سی T-D-K 60 جاپانی
کیسٹ پر ریکارڈ کروائے گئے ہیں جس کی قیمت
-/۹۰۰ روپے ہے۔ لاہور سے باہر رہائش
پذیر خواہش مند حضرات -/۹۱۰ روپے بذریعہ بنک
ڈرافٹ / منی آرڈر نشر القرآن کے نام درج ذیل
پتہ پر بھجوا کر یہ کیسٹس حاصل کر سکتے ہیں۔

نشر القرآن **تنظیم اسلامی**

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴
فون: ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ داؤد منزل
نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی

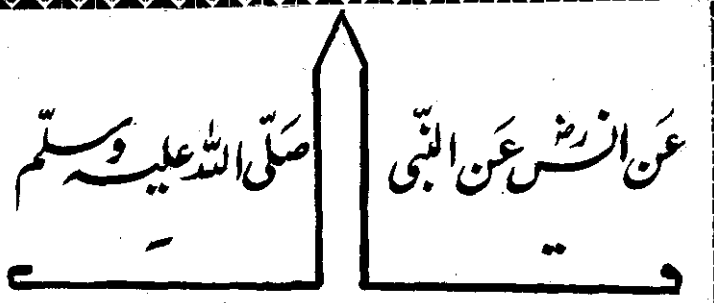

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ

حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

(رواہ البخاری)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، تم میں سے ایک شخص اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

رشید جیولری ہاؤس لاہور

ٹمپل روڈ ❁ سوہا بازار

۳۱۱۴۴۰ — ۳۰۴۳۳۳ ۶۴۴۳۳ — ۵۶۴۷۹

پروپرائیٹر: اے وحید

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

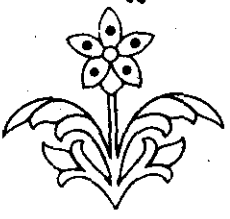

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲ - ایمپرس روڈ - لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

سانيو

SANYO

AIRCONDITIONERS REFRIGERATORS & FREEZERS

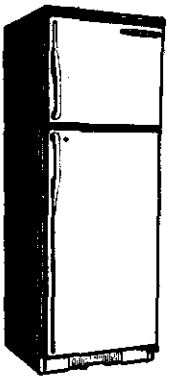

NO-FROST REFRIGERATORS

with exclusive features

- Two door with built-in lock.
- Spacious freezer compartment with drainage system, a new feature.
- Indicator pilot light on front door.
- In 4 pleasing colours (Green, Gold, Almond and White).
- One Year free service and 5 Years Guarantee on Compressor.

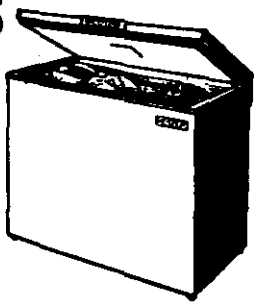

CHEST/UPRIGHT FREEZERS

AIR-CONDITIONERS

new in utility with higher efficiency

Capacity: 1½ Ton, 18000 BTU/h
Noiseless Operation.
Trouble Free Service. Auto Deflector (Swing System).
Brown Teak Wood finish Grill.

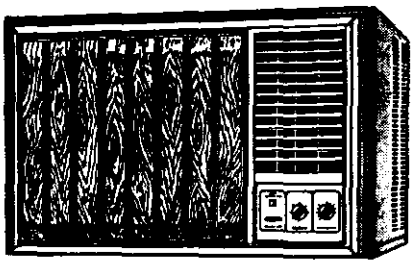

Available at all SANYO Authorised Dealers

MANUFACTURED/ASSEMBLED IN PAKISTAN

SPECIAL ATTENTION: Please ensure that you get your Worldwide Trading Company's 5 year Guarantee Certificate in order to avail free after Sales Service.

SOLE AGENTS IN PAKISTAN FOR ALL SANYO PRODUCTS

WORLDWIDE TRADING CO.

(SANYO CENTRE)
GARDEN ROAD, SADDAR, KARACHI. PHONES: (PABX) 525151-55 (5 Lines)
CABLE: "WORLDBEST" TELEX: 25109 WWTCO PK

786/WW-109/83

امپورٹ ۔ ایکسپورٹ کا قابلِ فخر ادارہ

رینبو انٹرنیشنل

فون: ۳۰۳۳۵۵ / ۳۰۳۳۷۷

برآمدی اشیاء

آرٹ سلک فیبرکس گارمنٹس ٭ بیڈ شیٹس
کاٹن کلاتھ ٭ کاٹن گارمنٹس ٭ احرام تولیہ ٭ تولیہ
ہینڈی کرافٹس ٭ لکڑی کا فرنیچر ۔

درآمدی اشیاء

لاکھ دانہ ٭ سٹکر فلم ٭ سوچ سٹارٹر
ریڈ سٹکس ٭ پولیسٹر ریان ۔

مرکزی دفاتر

II فلور غلام رسول بلڈنگ ۶۰ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

ذیلی دفاتر: کراچی ۔ فیصل آباد

ٹینٹ اور ترپال

بنانے کا
ممتاز ادارہ

ایچ نظام دین
اینڈ سنز

مرکزی دفتر

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی

نزلہ، زکام اور کھانسی
سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر
مناسب احتیاط برتئے۔ بروقت سُعالین لیجیے
جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ سُعالین کا باقاعدہ اور بروقت استعمال گھر کے ہر فرد کو نزلہ، زکام اور کھانسی سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک دو ٹکیاں روزانہ چوسیے۔
سُعالین کے چار قُرص تیز گرم پانی میں گھول لیجیے،
جوشاندہ تیار ہے جو نزلہ، زکام اور کھانسی کے لیے بدرجہا مفید ہے۔
ایسی ایک خوراک صبح و شب لیجیے۔
سُعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی
کی مفید دوا
SUALIN
50 TABL
A HERBAL CU
COUGH, CO
AND
BRONCHI
HAMDARD PAK
سُعالین
۵۰ ٹکیاں
SUALIN
A HERBAL CURE FOR COUGH, COLDS
AND BRONCHITIS
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
آوازِ اخلاق
وقت ایسی زمین ہے جس میں محنت کے بغیر کچھ نہیں پیدا ہوتا۔
نوزو
ناک کے ورم، سوزش اور بندش کے لیے مفید۔
ایک پھوار ناک کھول دیتی ہے۔
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
Adarts SUA-2/84

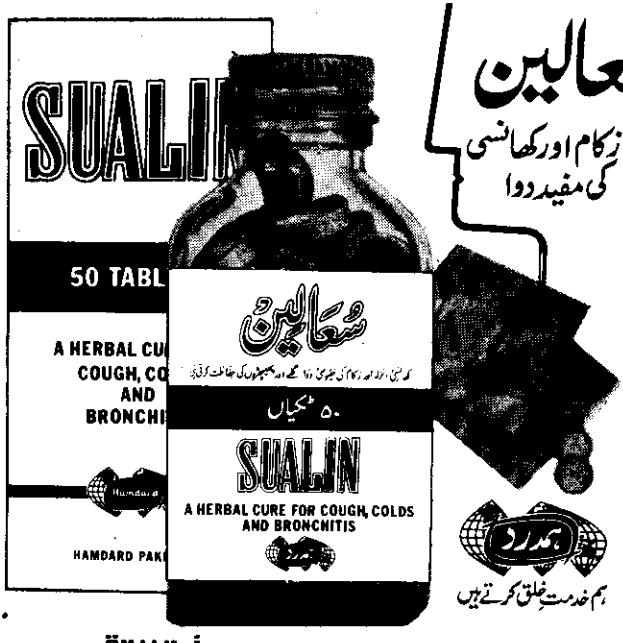

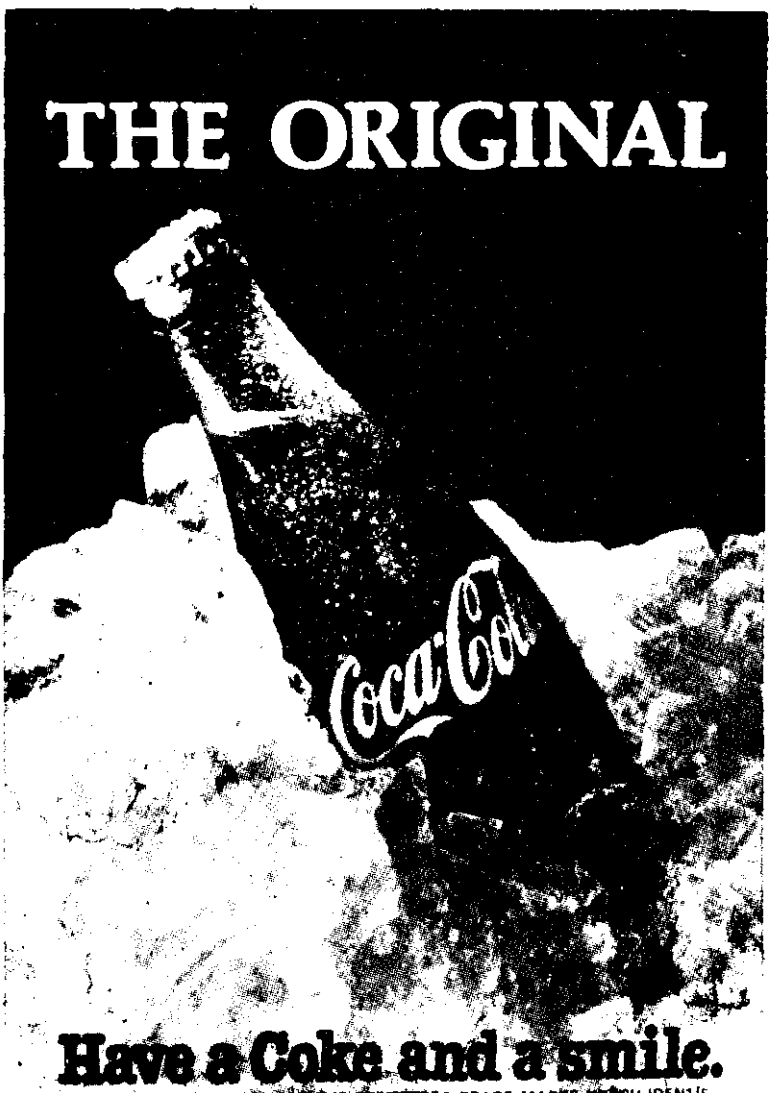

THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and a smile.
"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY
THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY.
paragon

ہدایات برائے شرکاء سالانہ اجتماع تنظیم اسلامی

(منجانب چودھری غلام محمد (قیم تنظیم اسلامی)

(۱) سالانہ اجتماع میں تمام رفقاء تنظیم کی شرکت لازمی ہے۔ اگر کوئی عذر ہو تو پیشگی معذرت ضروری ہوگی۔

(۲) خواتین کے لئے خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ تنظیم سے منسلک یا تنظیم کے کام سے دلچسپی رکھنے والی تمام خواتین اجتماع میں شرکت کی امکانی کوشش کریں۔ —— اجتماع میں شرکت کرنے والی خواتین ہمیں اپنی آمد سے پیشگی مطلع فرما دیں۔

(۳) سالانہ اجتماع کی پہلی نشست ان شاء اللہ ۲۴ کی صبح کو ہوگی۔ تاہم تمام رفقاء حسب ہدایت امیر تنظیم ۲۲ مارچ کو قبل از دوپہر پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ ۲۲ کو امیر تنظیم کے خطبۂ جمعہ میں بھی شرکت ہو جائے اور شام کو مسجد شہداء کے درسِ قرآن میں شریک ہو سکیں اور پھر ۲۳ کی صبح انجمن کے سالانہ اجلاس اور پھر شام کو محاضراتِ قرآنی کی پہلی نشست میں بھی شرکت کر سکیں۔ بہرکیف ۲۳ کی شام تک ہر رفیق لازماً قرآن اکیڈمی پہنچ جائے۔

(۴) بیرون لاہور سے تشریف لانے والے رفقاء نوٹ فرمالیں کہ جمعہ ۲۲ مارچ کی صبح سے تنظیم کی جانب سے لاہور ریلوے سٹیشن کے باہر بائیں جانب رفقاء کی سہولت کے لئے ایک کیمپ لگا دیا جائیگا۔ جو حضرات بھی بذریعہ ٹرین تشریف لائیں وہ سٹیشن سے باہر کیمپ میں موجود رفقاء سے ضرور رابطہ کریں۔ بسوں، منی بسوں اور فلائنگ کوچز سے آنے والے حضرات کے لئے بھی وہ جگہ دُور نہیں ہے۔ وہاں تک وہ خود پہنچ جائیں تو ان شاء اللہ قرآن اکیڈمی تک ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو جائے گا۔ یہ کیمپ جمعہ کی شام تک قائم رہے گا۔ ہفتہ کو آنے والے حضرات قرآن اکیڈمی خود پہنچیں!

(۵) اجتماع کے دوران تمام رفقاء کا قرآن اکیڈمی میں رہائش پذیر ہونا لازمی ہے۔ معذرت کی صورت میں پیشگی تحریری درخواست ضروری ہوگی۔

(۶) موسم کے مطابق ضروریات کا مختصر سامان ہمراہ ہونا چاہیئے۔

(۷) اگر کوئی رفیق کوئی تجویز پیش کرنا چاہیں یا کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کرنا چاہیں تو ۱۵ مارچ تک تحریری شکل میں دفتر کو ارسال کر دیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نظم کی پابندی کے ساتھ دین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحمدُ لِلّٰہِ

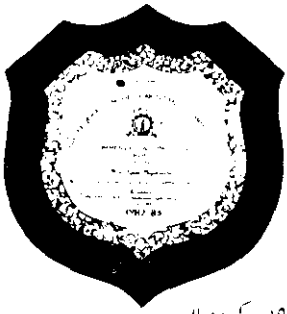

ایک اور اعزاز

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گزشتہ سالوں کی طرح ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران
بھی ہماری بہترین برآمدی کارکردگی اور وطن عزیز کے لیے کثیر زرمبادلہ کمانے پر فیڈریشن آف
پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی جانب سے ہم ایک بار پھر

بہترین برآمدی کارکردگی کی ٹرافی

کے مستحق قرار پائے

یہ ٹرافی جناب **جنرل محمد ضیاء الحق** صاحب صدر پاکستان نے ایک پروقار تقریب میں اپنے ہاتھوں سے ہمیں عطا فرمائی۔

ہمیں خیمے، ترپالیں اور کینوس کی دیگر مصنوعات کے سب
سے بڑے برآمد کنندگان ہونے کا بجا طور پر شرف حاصل ہے۔

SNDS

حاجی شیخ نورالدّین اینڈ سنز لمیٹڈ

پاکستان میں کینوس مصنوعات کے سب سے بڑے برآمد کنندگان

ہیڈ آفس: حفیظ چیمبرز، ۸۵۔ شاہراہ قائداعظم، لاہور ۱، پاکستان۔
فون: ۳۰۶۴۶۸ - ۳۰۵۴۶۹، تار: شاہی خیمہ، ٹیلکس: 44543 NOOR PK
ایگزیکٹو آفس: ۶۱۹-۶۱۴ کامرس سینٹر، چھٹی منزل، حسرت موہانی روڈ، کراچی ۱، پاکستان۔
فون: ۲۱۳۵۴۰ - ۲۱۴۳۱۷، تار: TARPAULIN، ٹیلکس: 25480 NOOR PK

Regd. L. No. 7360

MONTHLY **"MEESAQ"** LAHORE

Vol. 34	MARCH 1985	No. 3

Siddiq Sons Industries Ltd.

Largest Manufacturers & Exporters of :

WATERPROOF COTTON CANVAS, TARPAULINS, TENTS, WEBBING AND OTHER CANVAS PRODUCTS,

HEAD OFFICE :

709, 7TH FLOOR, QAMAR HOUSE,
M.A. JINNAH ROAD, KARACHI (PAKISTAN)

2 - K GULBERG II, SHAHRAH-E-IQBAL, LAHORE.
TELEPHONE : 870512 880731